ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دار الاسلام جمال پور، پٹھانکوٹ

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قیمت سالانہ

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت مجلد ۳ روپے علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مُسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۲۸۰ صفحات

قیمت غیر مجلد -/-/۲ علاوہ محصولڈاک

فہرست مضامین

ذوالقعدہ، ذوالحجہ ۶۲ھ (نومبر، دسمبر ۴۳ء) جلد ۲۳، عدد ۵، ۶

نمبر خریداری کا حوالہ منی آرڈر کوپن پر ضرور دیا کیجیے

(منیجر)

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ، لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام متصل پٹھانکوٹ سے شائع کیا

روداد اجتماع دربھنگہ

از سید عبدالعزیز صاحب شرقی

[افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کے باعث اس مرتبہ "اشارات" درج نہیں کیے جا سکے تاکہ اجتماع دربھنگہ کی پوری روداد ایک ہی اشاعت میں درج ہو جائے۔ ایڈیٹر]

حسب اعلان ۲۱، ۲۲ ر اکتوبر ۴۳ء کو شرقی یوپی اور بہار کے ارکان جماعت کا اجتماع دربھنگہ میں منعقد ہوا جس میں حسب ذیل ارکان شریک ہوئے:-

مرکز سے مولانا مودودی صاحب (امیر جماعت) اور سید عبدالعزیز شرقی۔ لاہور سے جناب نصر اللہ خاں صاحب عزیز مدیر مسلمان۔ الٰہ آباد سے ڈاکٹر نذیر علی صاحب زیدی، محمد اسحاق صاحب و عبدالرشید صاحب۔ سرائے میر سے مولانا امین احسن صاحب و مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی۔ پٹنہ سے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، تقی الدین صاحب نعمانی، حافظ محمد عثمان صاحب، ڈاکٹر نور العین صاحب اور ڈاکٹر غیاث الدین صاحب۔ مونگیر سے جناب فضل الرحمٰن صاحب (سابق وکیل)۔ دربھنگہ سے سید محمد حسنین صاحب جامی۔

ارکان کے علاوہ آٹھ دس ہمدردانِ جماعت بھی مختلف مقامات سے آگئے تھے۔

اجتماع کے لیے دربھنگہ کی آبادی سے ڈیڑھ دو میل دور سرسبز کھیتوں کے درمیان ایک الگ تھلگ مقام تجویز کیا گیا تھا تاکہ سکون کے ساتھ کام کیا جا سکے۔ ۲۱ ر اکتوبر کی صبح کو پہلی نشست ہوئی۔ تلاوتِ قرآن مجید کے بعد سب سے پہلے ارکانِ جماعت کا ایک دوسرے سے تفصیلی تعارف ہوا۔ اس کے بعد مولانا مودودی صاحب نے ایک افتتاحی تقریر کی اور حسب ذیل امور پر روشنی ڈالی:-

۱- تحریک اس وقت کس مرحلہ پر ہے؟

۲۔ ارکان اور جماعتوں کی حالت کیا ہے ؟

۳۔ کس نوعیت کی مشکلات درپیش ہیں ؟

۴۔ مالی حالات کیسے ہیں ؟

۵۔ کام کو کس نقشہ پر آگے بڑھانا مدنظر ہے ؟

۶۔ ہماری تحریک اور دوسری تحریکوں کی نوعیت میں فرق کیا ہے ؟

۷۔ کس قسم کے کام اصل انقلابی حرکت سے پہلے کرنے ضروری ہیں ؟

۸۔ بعض ارکانِ جماعت میں جو سردمہری پائی جاتی ہے اس کے اصل وجوہ کیا ہیں ؟

۹۔ کن غلط فہمیوں کے ماتحت محدود پروگراموں کا مطالبہ کیا جارہا ہے ؟

پوری تقریر کو لفظاً بلفظٍ یہاں نقل کرنا تو مشکل ہے البتہ جماعت کی رہبری کے لیے تقریر کے ضروری حصے یہاں پیش کیے جاتے ہیں :-

"ہماری تحریک اس وقت چند ارتقائی منازل کو عبور کرتی ہوئی اِس مرحلہ پر پہنچ گئی ہے کہ جہاں تک ہمارے نصب العین کا تعلق ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اس سے متاثر ہو چکی ہیں اور وہ بات جسے تین چار سال پہلے ہماری سیاسی اور مذہبی جماعتیں زبان پر لانے کے لیے تیار نہیں تھیں، اب اسے بیشتر جماعتیں اپنا نصب العین قرار دینے لگی ہیں۔ لیکن یہ چیز خواہ ہمارے لیے کتنی ہی باعث مسرت ہو، ہمیں اس پر مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے کیونکہ جہاں تک مسلم جماعتوں کا تعلق ہے، وہ بڑی آسانی سے اس نصب العین کو قبول کر لیتی ہیں مگر اسی آسانی سے اس نصب العین کے مخصوص طریق کار اور ذمہ داریوں اور اخلاقی مقتضیات کو قبول نہیں کر سکتیں۔ اس وقت یہ خطرہ درپیش ہے کہ کہیں یہ نصب العین ہنگامہ پسند جماعتوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر نہ رہ جائے اور وہ اس کو ایک سنجیدہ مقصدِ حیات کی حیثیت سے کرا ٹھنے کے بجائے دنیا کے سامنے ایک مضحکہ نہ بنا دیں۔ لہٰذا اب زور اس پہلو پر دینے کی ضرورت ہے کہ اس نصب العین کے لیے جدوجہد کرنا تو درکنار، اس کا نام زبان پر لانے کے لیے بھی اعلیٰ درجہ کے کیرکٹر کی ضرورت ہے۔ اسی پہلو

سے نشرِ افکار کی مہم اس زور سے شروع ہو جانی چاہیے کہ حکومتِ الٰہیہ کا نعرہ بلند کرنے والی جماعتیں دیانت دارانہ طریقہ سے اس کی اخلاقی ذمہ داریوں کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں اور اس نعرہ کے اقتضا کے مطابق کام کریں۔ یا اگر انھیں کسی دوسرے راستہ ہی پر چلنا ہو تو عوام فریبی سے باز آجائیں۔

خطرہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پچھلے پچیس تیس سال سے مسلمانوں کی سیاسی تربیت بہت غلط طرز پر ہوئی ہے۔ ان کی مستقل اجتماعی خصلت یہ بن گئی ہے کہ ایک تخیل پر ٹھوس کام کرنے کے بجائے کسی نقشۂ کار (Plan) کو مرتب کیے بغیر شور مچا دیتے ہیں۔ یہ غلط طرزِ تحریک جو جمود سے کچھ کم مضر نہیں ہے، سخت مقبولِ عوام ہے لیکن ہم اسے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں تحریک کا پورا نقشۂ کار مرتب کرنے (Planning) سے پہلے دعوت کو ہنگامہ پسند عوام تک پہنچانے سے احتراز کرنا ہے۔ خوب سوچ لیجیے کہ جس میدانِ جنگ میں آپ اتر رہے ہیں اس میں دشمن کے مورچے کدھر کدھر اور کس ترتیب سے پھیلے ہوئے ہیں اور اس کے مقابلہ میں آپ کو کس طرز پر مورچہ بندی کرنی ہے، آپ کے کمزور پہلو کون کونسے ہیں، آپ کی جمعیت کو کس کس پہلو سے مضبوط ہونا چاہیے، پیش قدمی کدھر سے ہو اور کس رفتار سے ہو۔ غرض یہ کام ہلڑ مچانے سے نہیں ہوگا۔ اس کے لیے تو ایک ہشیار جنرل کی دوربینی و وسیع النظری ہو اس کے ساتھ ایک نظامِ اطاعت میں جکڑی ہوئی جمعیت کی جد و جہد مطلوب ہے۔

"موجودہ مرحلہ کی نزاکت کچھ اس وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ جہاں تک بنیادی افکار کا تعلق ہے ان کو پھیلانے میں ہم بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں لیکن ہمارے پاس ایسی سیرت اور ایسی اعلیٰ قابلیتیں رکھنے والا ایک منظم گروہ مہیا نہیں ہو سکا ہے جو دنیا کے سامنے ان عملی تفصیلات کو پیش کر سکے جن کی مانگ ہمارے ان افکار پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے والے لوگوں میں فوراً پیدا ہو جاتی ہے۔ جب لوگ ہم سے اجتماعی زندگی کا وہ تفصیلی نقشہ مانگنے لگتے ہیں جو ہمارے نظامِ فکر کی بنیاد پر بننا چاہیے تو ہم اسے پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ محض اس لیے کہ ان تفصیلات کو مرتب کرنا ایک شخص واحد کے بس کا کام نہیں ہے بلکہ اس کے لیے صاحبِ فکر محققین کا ایک گروہ درکار ہے جو باہم محنت اور کاوش سے اس کام کو انجام دیتا رہے۔"

"ہماری دعوت پر لبیک کہنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد روشن اور تاریک دونوں پہلو رکھتی ہے۔ روشن پہلو یہ کہ ہماری طرف مسلمانوں کا وہی عنصر کھنچ رہا ہے جو صالح اور کارآمد ہے۔ ہماری پکار پر جو لوگ "نَحْنُ اَنْصَارُ اللہ" کہہ کر جمع ہو رہے ہیں ان میں ایک نہایت خوشگوار اخلاقی تغیر پایا جاتا ہے۔ لیکن اس روشن پہلو کے ساتھ تاریک پہلو یہ ہے کہ ارکانِ جماعت میں صبر اور اپنے مقصد سے گہری وابستگی اور اپنے "ہولناک عہد" کی ذمہ داریوں کے احساس میں کمی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے بہت جلدی سرد مہری پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے اگر پیہم اکسانے اور گرمانے کا سلسلہ جاری نہ رہے۔ گویا اگر اکسانے والا نہ ہو اور کوئی دلچسپ کام ان کو فوراً نہ بتا دیا جائے تو "اِنْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ" کی صورت بہت آسانی سے رونما ہو سکتی ہے۔ ہمارے ارکان میں یہ تصور پوری شدت سے کارفرما نہیں ہے کہ شعور و ادراک اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ شہادتِ توحید و رسالت ادا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کا عہد کسی شخص یا جماعت کے ساتھ نہیں بندھ رہا ہے بلکہ خدا کے ساتھ بندھ رہا ہے اور اس شہادت کے ساتھ جو نصب العین خود بخود مسلمانوں کی زندگی کا قرار پا جاتا ہے اس کے لیے کام کرنا شہادت ادا کرنے والے کا اپنا فریضہ بن جاتا ہے۔ دوسرا ایک تاریک پہلو ہمارے جماعتی نظام میں یہ ہے کہ اطاعتِ امر کی کمی پائی جاتی ہے۔ نیز ارکانِ جماعت میں باہم وابستگی اور تعاون میں نمایاں ترقی نہیں ہوئی اور ابھی تک ایسے لوگ ہم کو نہیں ملے ہیں جو مقامی امارتوں کے فرائض اچھی طرح سمجھیں اور مقامی جماعتوں کے ارکان سے صحیح طرز پر کام لے سکیں"۔

"مشکلات کا جائزہ لینے سے تین چیزیں بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ اولاً ہمارے پاس مردانِ کار کی بہت کمی ہے۔ دوسرے ذرائع و وسائل بہت محدود ہیں اور جنگ کی معاشی تاخت نے تو انھیں صفر کے درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ تیسری مشکل جو اسی دوسری مشکل سے پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ تعمیری کام کرنے والے لوگوں کا جو محدود سا ذخیرہ جماعت کے ہاتھ آیا ہے وہ بالکل منتشر ہے اور اسے سمیٹنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ کچھ پُرزے ہیں جو ہندوستان کے وسیع حدود میں بکھرے پڑے ہیں۔ انھیں جمع کر کے جوڑ دینے کی اسکیم بر سرِ عمل نہیں آ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو مرکز کا فکری "پاور ہاؤس" مکمل ہو سکا ہے، نہ عملی کارروائیوں کی ضروری مشینیں باضابطہ طور پر نصب ہو سکی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس صورتِ حالات کے بعض

اسباب پر ہماری دسترس نہیں ہے لیکن جماعت اس سلسلہ میں ذمہ داری سے بالکل بری بھی نہیں ہے۔ ہمارے رفقاء میں مالی ایثار کا جذبہ بہت کم بلکہ صفر کے برابر ہے۔ ابھی تک لِلّٰہ مقصدِ حیات کے لیے روپیہ صرف کرنا لوگوں نے نہیں سیکھا اور انفاق فی سبیل اللہ کا ولولہ ناپید ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری جماعتوں کی طرح اگر چندہ کی اپیلوں سے لوگوں کو ٹھیلا جاتا رہے اور "اُدْخُلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ" کی صدا لگائی جاتی رہے تو یہ کمی پوری ہو جائے۔ لیکن ہم اسے پسند نہیں کرتے کہ لوگ خارجی تحریک کے محتاج ہو کر رہ جائیں۔ ہماری تحریک کا مخصوص مزاج یہ چاہتا ہے کہ جو کچھ کیا جائے اندرونی تحریک سے کیا جائے۔ جس طرح ایک فرد اپنی بقاء کے لیے بغیر کسی خارجی تحریک کے معدہ کو غذا بہم پہنچاتا ہے اسی طرح جماعت کو اپنے جماعتی معدہ یعنی بیت المال کی بھوک کا خود احساس کرنا چاہیئے ورنہ زندگی کی حرکت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکے گی۔

یہ صحیح ہے کہ ہمارے ارکان بیشتر وہی لوگ ہیں جو معاشی اعتبار سے کچھ زیادہ خوش حال نہیں ہیں لیکن اس امر کو نہ بھولنا چاہیے کہ اس دعوت نے کبھی آغاز میں خوش حال لوگوں کو اپیل نہیں کیا ہے۔ پہلے بھی زیادہ تر ایسے ہی لوگ اس کی طرف کھنچتے رہے ہیں جن کی مالی حالت بہتر نہ تھی۔ دراصل مالی ایثار کے جذبہ کا تعلق جیب کے ثقل سے اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا دل کی لگن سے ہے۔ اسی لگن میں کمی معلوم ہوتی ہے۔

تاہم مالی حالت بالکل مایوس کن نہیں ہے۔ اس بدحالی کے زمانہ میں بھی کچھ نہ کچھ کام ہو رہا ہے لیکن بیت المال اس پوزیشن میں بھی نہیں ہے کہ کوئی بڑا کام شروع کیا جا سکے۔ جتنی تعمیری اسکیمیں مدنظر تھیں، معرضِ التوا میں ہیں۔ سب سے بڑا ذریعہ آمدنی بکڈپو تھا مگر کاغذ کی گرانی اور نایابی اس کی جان کی لاگو ہو گئی ہے۔ باہر سے جو رقمیں اعانت کے لیے بلا طلب آیا کرتی تھیں ۱۹۴۲ء کی بہ نسبت ۱۹۴۳ء میں ان کے اندر نمایاں کمی آگئی ہے۔ ان حالات کو مدنظر رکھ کر ہر رفیق کو اپنی جگہ سوچنا چاہیے اور اپنے احساسِ ذمہ داری سے استفتا کرنا چاہیے کہ اس کا فرض کیا ہے۔

"اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ارکان کو اپنی تحریک اور دوسری تحریکوں کے فرق کا پورا پورا شعور نہیں ہے۔ حالانکہ اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک عام تحریکوں سے بنیادی اختلافات

رکھتی ہے۔ اولاً یہ کہ اس کے سامنے پوری زندگی کا مسئلہ ہے، زندگی کے کسی ایک پہلو کا نہیں۔ ثانیاً یہ کہ خارج سے پہلے یہ باطن سے بحث کرتی ہے۔ جہاں تک پہلے پہلو کا تعلق ہے، ہمارے سامنے کام اتنا بڑا اور اتنا اہم ہے جو اسلامی تحریک کے سوا دنیا کی کسی تحریک کے سامنے نہیں ہے اور ہم اس جلد بازی کے ساتھ کام نہیں کر سکتے جس جلد بازی سے دوسرے کر سکتے ہیں۔ پھر چونکہ ہمارے لیے خارج سے بڑھ کر باطن اہمیت رکھتا ہے اس وجہ سے محض تنظیم اور محض چھوٹے سے ضابطہ بند پروگرام پر لوگوں کو چلانے اور عوام کو کسی ڈھرے پر لگا دینے سے ہمارا کام نہیں چلتا۔ یہ عوام میں عمومی تحریک (Mass-movement) چلانے سے پہلے ایسے آدمیوں کو تیار کرنے کی فکر کرتی ہے جو بہترین اسلامی سیرت کے حامل ہوں اور ایسی اعلیٰ درجہ کی دماغی صلاحیتیں بھی رکھتے ہوں کہ تعمیر افکار کے ساتھ اجتماعی قیادت کے دوہرے فرائض کو سنبھال سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں عوام میں تحریک کو پھیلا دینے کے لیے جلدی نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری تمام تر کوشش اس وقت یہ ہے کہ ملک کے اہل دماغ طبقوں کو متاثر کیا جائے اور ان کو کھنگال کر صالح ترین افراد کو چھانٹ لینے کی کوشش کی جائے جو آگے چل کر عوام کے لیڈر بھی بن سکیں اور تہذیبی و تمدنی معمار بھی۔ یہ کام چونکہ ٹھنڈے دل سے کرنے کا ہے اور ایک عمومی تحریک کی طرح فوری ہل چل اس میں نظر نہیں آ سکتی ہے، اس وجہ سے نہ صرف ہمارے ہمدرد و ہم خیال لوگ بلکہ خود ہمارے ارکان تک بددل ہونے لگتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ارکان جماعت کام کے اس نقشہ کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اپنی قوتیں بددلی کی نذر کرنے کے بجائے کسی مفید کام میں استعمال کریں۔

یہ اعتراض بجا ہے کہ کثیر التعداد عوام کو اس نقشہ کے مطابق بلند سیرت بنانے کے لیے مدت مدید درکار ہے۔ مگر ہم اپنے انقلابی پروگرام کو عوام کی کامل اصلاح کے انتظار میں ملتوی کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے پیش نظر صرف یہ نقشہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لیے ان کی قوتوں کو راہ حق میں استعمال کرنے کے لیے ایک ایسی مختصر جماعت فراہم کر لی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کیرکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقہ کے عوام کو سنبھال سکے۔ اس کی ذات عوام کا مرجع بن جائے اور کسی مصنوعی کوشش کے بغیر بالکل فطری طریقہ سے عوام کی لیڈرشپ کا منصب اُسے حاصل ہو جائے۔ مگر صرف مرجعیت مفید نہیں ہے۔ اس مرجعیت سے کام لینے کے لیے دماغی صلاحیتیں بھی ہونی چاہییں تاکہ ان مرکزی شخصیتوں کے ذریعہ سے

عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم ہو کر اسلامی انقلاب کی راہ میں صرف ہوں۔ ایک ٹھوس، پائیدار اور ہمہ گیر انقلاب کا لازمی ابتدائی مرحلہ یہی ہے۔ اس مرحلہ کو صبر سے طے کرنا ہی پڑے گا، ورنہ تحریک کی تباہی ناگزیر ہے۔ اگر موجودہ حالات میں عوام کو اکسا دیا جائے جبکہ عوام کو سنبھال کر لے چلنے والے مقامی رہنما (Sub-leaders) موجود نہیں ہیں تو عوام بالکل بے راہ روی پر اتر آئیں گے اور اپنے آپ کو نااہل لوگوں کے حوالے کر دیں گے۔"

"عمومی تحریک (Mass-movement) کے آغاز سے پہلے چند تعمیری کام کر لینے ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اپنے تعلیمی پروگرام کی بنا ڈال دیں، کیونکہ ضروری نہیں کہ ہم اپنی زندگی میں اپنے نصب العین تک پہنچ جائیں۔ اس لیے ہمیں ابھی سے یہ فکر کرنی چاہیے کہ ہم اپنی جگہ اپنے سے بہتر کام کرنے کے لیے آئندہ نسل کو تیار کرنا شروع کر دیں۔ دوسرے ہمیں اہل قلم کا ایک ایسا لشکر تیار کر لینا چاہیے جو علوم و فنون اور ادب کے ہر پہلو سے نظام حاضر پر حملہ آور ہو سکے۔ کچھ سیاسی مفکر ہوں جو حال کی کافرانہ سیاست کے مکروہ خدوخال کو خوب نمایاں کریں، کچھ معاشی ماہرین ہوں جو رائج الوقت معاشی تنظیم کے عیوب کو کھولیں، کچھ علمائے قانون کی ضرورت ہے جو انسانی قوانین کی بے اعتدالیوں کو نمایاں کریں، اخلاق و نفسیات کے کچھ حکماء چاہییں جو عہد حاضر کے علم النفس اور علم الاخلاق کی کوتاہ بینیوں کی نشان دہی کریں، اور اس تخریبی کارروائی کے ساتھ ساتھ یہ لوگ علوم کی نئی تدوین کا تعمیری کام بھی سنبھالیں۔ ان مجتہد مفکرین کو مدد بہم پہنچانے کے لیے ادیبوں، افسانہ نگاروں اور ڈرامہ نویسوں کا ایک گروہ بھی ضرور ہونا چاہیے جو فکری میدان کارزار میں "گوریلا وار" لڑتا رہے۔ تیسرا تعمیری کام ہمیں یہ کرنا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے عمومی تحریک کو چلانے کے لیے کارکنوں اور رضا کاروں کی تربیت کی جائے۔ ہمیں مقرروں سے لے کر خاموش کارکنوں تک بالکل نئی وضع کے کارندے درکار ہیں جن کے اندر خشیۃ اللہ کی روح طاری و ساری ہو۔ ان تین شعبوں میں جس کم سے کم تعمیری کام کی ضرورت ہے اس کو انجام دینے سے پہلے یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ ہم عوام میں انقلابی دعوت پھیلانے کے لیے کوئی کامیاب اقدام کر سکتے ہیں۔"

"کام کے اس نقشہ کو اب تک سمجھا نہیں گیا ہے اور آنکھیں انہیں تحریکوں سے واقف ہیں جو پچھلے ۲۰، ۲۵

برس سے چلتی رہی ہیں، اس لیے لوگ بجائے اس کے کہ ان پہلوؤں میں اپنے آپ کو اور اپنی جماعت کو تیار کرنے پر اپنی قوتوں کو صرف کریں، وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کوئی چلتا پھرتا کام فوراً ہونے لگے اور جب وہ ہوتا نظر نہیں آتا تو ان کے اوپر مایوسی طاری ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ بہت سے ارکان جماعت ایسے ہیں جنھوں نے مجھ سے بالمشافہہ اور بالمراسلہ یہ سوال کیا ہے کہ ہمارے لیے پروگرام کیا ہے اور ہم کیا کریں؟ یہ پروگرام کا مطالبہ اور یہ تصور کہ ان لوگوں کو کرنے کے لیے کوئی کام بتایا نہیں گیا، اس کی بنا بھی یہی ہے کہ ہمارے رفقا ابھی تک پوری طرح سے نہیں سمجھے ہیں کہ جس تحریک کی خدمت کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو پیش کیا ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ درحقیقت مسلمان کو اگر اس امر کا پورا شعور حاصل ہو کہ اس دنیا میں اس کی حیثیت کیا ہے اور اس کی ذمہ داری کتنی بھاری ہے تو اسے خود بخود معلوم ہو جائے کہ اس کی پوری زندگی کے لیے ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر پروگرام موجود ہے جس پر اگر وہ پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ عمل کرے تو اسے ایک لمحہ کی فرصت بھی نہیں مل سکتی۔

ہر شخص کو بہت سی جسمانی اور ذہنی قوتیں اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں۔ بہت سے اسباب زندگی بطور امانت اس کی تحویل میں دیے ہیں، بہت سے انسانوں کے ساتھ اسے تعلقات کے رشتوں میں باندھا ہے اور ان رشتوں کے لحاظ سے مختلف ذمہ داریاں اس پر عائد کی ہیں۔ خدا کے سامنے ہر شخص کی ذمہ داری اس لحاظ سے ہے کہ وہ اپنی ان قوتوں کو کس طرح استعمال کر رہا ہے اور خدا کی سپرد کی ہوئی امانتوں میں کن طریقوں سے تصرف کر رہا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے پروگرام یہی ہے کہ ہر وقت اپنا حساب لے کر دیکھتا رہے کہ اس عظیم الشان ٹرسٹ کا ٹرسٹی ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے فرائض کو کہاں تک انجام دے رہا ہے اور ان میں خدا کے منشا کو پورا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہے؟ مثلاً اگر کوئی شخص صرف اپنی قوت گویائی کے حساب ہی پر متوجہ رہے اور پیہم اس کوشش میں لگا رہے کہ زبان کی طاقت جس مقصد کے لیے اللہ نے اس کو عطا کی تھی اس کو کہاں تک پورا کر رہا ہے اور اس عطیہ کے ساتھ جو ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں ان کو کہاں تک نباہ رہا ہے تو شاید اس سلسلہ کے پروگرام سے ہی اس کو اتنی فرصت نہ ملے کہ اس کے بعد کسی دوسرے پروگرام کے پوچھنے کی اس کو ضرورت پیش آئے۔ یہی حال دوسری بے شمار قوتوں کی ذمہ داریوں کا ہے۔

اگر میں چند چھوٹے موٹے کاموں کو بطور پروگرام کے آپ لوگوں کے سامنے پیش کر دوں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ اس بڑے اور ہمہ گیر پروگرام سے جس کی بے شمار مدات ہیں اور جس پر زندگی کے ہر سانس میں آپ کو عمل کرنا ہے، آپ غافل ہو جائیں گے اور سمجھیں گے کہ اصل کرنے کا کام وہ چند اعمال ہیں جو ایک چھوٹے سے لائحۂ عمل میں آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔ اس لیے میں شدید اور پے در پے مطالبوں کے باوجود ایسی کوئی چیز پیش کرنے سے سخت احتراز کر رہا ہوں اور آئندہ بھی احتراز کروں گا۔

میری انتہائی کوشش یہ ہے کہ ہر شخص جو جماعت میں داخل ہو وہ اس بڑے پروگرام کو سمجھے اور اس پر عملدرآمد کرے جو شعوری مسلمان ہونے کے ساتھ ہی آپ سے آپ اس کی زندگی کے لیے قرار پا جاتا ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب میں اپنے رفقاء سے بسا اوقات اس قسم کی باتیں سنتا ہوں کہ "ہمارے لیے کرنے کا کام کیا ہے؟" میں پوچھتا ہوں کہ کیا اپنی تمام کمزوریوں کو آپ دور کر چکے ہیں اور اپنے نفس کو کامل طریقہ پر اللہ کا بندہ بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں؟ کیا اپنی زندگی کو جاہلیت کے ہر شائبہ سے آپ پاک کر چکے ہیں؟ کیا اُن تمام حقوق کی ادائگی سے بھی آپ فارغ ہو چکے ہیں جو اللہ اور اس کے دین کی طرف سے آپ کے دماغ پر، آپ کے دل پر، آپ کے اعضاء و جوارح پر، آپ کی ذہنی و جسمانی قوتوں پر اور آپ کے مملوکہ اموال پر عائد ہوتے ہیں؟ اور کیا آپ کے گرد و پیش کوئی انسان بھی خدا سے غافل یا گمراہ یا دینِ حق سے ناواقف یا اخلاقی پستیوں میں گرا ہوا نہیں رہا ہے جس کی اصلاح کا فرض آپ پر عائد ہوتا ہو؟ —— اگر ایسا نہیں ہے تو آپ کے اندر یہ تخیل آ کہاں سے گیا کہ آپ کے لیے کرنے کا کوئی کام نہیں رہا ہے اور آپ کو کچھ اور کام بتایا جائے جس میں آپ مشغول ہوں۔ یہ سارے کام تو اَن ہوئے پڑے ہیں جو آپ سے ہر وقت کا شدید انہماک چاہتے ہیں اور اگر آپ ان کو اس طرح انجام دینا چاہیں جیسا کہ ان کا حق ہے تو آپ کو ایک لمحہ کے لیے دم لینے کی فرصت بھی نہیں مل سکتی۔ مگر چونکہ آپ کو ابھی تک پچھلی سطحی تحریکوں کے طور طریقوں کی چاٹ پڑی ہوئی ہے اور آپ کے اندر پوری طرح اسلامی تحریک کا احساس بیدار نہیں ہوا ہے اس لیے کام نہ ہونے کی اور پروگرام کے فقدان کی شکایتیں آپ کی زبان پر آتی ہیں —— ان شکایتوں کے دفعیہ کی صورت میرے لیے یہی ہے کہ کام اور پروگرام بتانے کے بجائے میں آپ لوگوں میں صرف اس احساسِ ذمہ داری اور اس شعورِ اسلامی کو بیدار کرنے

کی کوشش کروں جس کے بعد کبھی نہ ختم ہونے والے کام اور دائماً منہمک رکھنے والے پروگرام کا نقشہ خود بخود آپ کے سامنے آسکتا ہے"۔

"ارکانِ جماعت کی طرف سے بار بار اس خواہش کا اظہار ہوتا رہتا ہے کہ مرکز سے پیہم ان کو ہدایات ملتی رہیں اور جماعتی کارروائیوں کے سلسلہ میں لوگوں کو پیہم حرکت دی جاتی رہے۔ میں اس طریق کار کو صحیح نہیں سمجھتا۔ میری کوشش یہ ہے کہ ہر جگہ مقامی جماعت کے نظام کو چلانے کے لیے ایسے لوگ ہونے چاہییں جن میں خود قوت کارکردگی (Initiative) موجود ہو اور جو اپنے فرائض کو خود سمجھنے اور ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ لگے بندھے کاموں کو مقرر طریقوں کے مطابق انجام دیتے رہنے کی عادت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ میرا کام یہ ہے کہ میں اصول اور طریق کار سمجھا دوں اور اصولی ہدایات دے کر چھوڑ دوں۔ اس کے بعد ارکانِ جماعت اور خصوصاً مقامی جماعتوں کے امراء کو خود اپنے کام کو سمجھنا اور انجام دینا چاہیے۔ جہاں کسی قسم کی مشکلات پیش آئیں، کہیں کوئی پیچیدگی پیدا ہو یا کوئی نئی اسکیم وہ اپنے حلقہ میں عمل میں لانا چاہتے ہوں وہاں وہ مجھ سے رجوع کر سکتے ہیں۔ لیکن ہر وقت اس انتظار میں رہنا کہ ہدایات ملیں اور ٹھیلا اور دھکا دیا جاتا رہے اور نگرانی اور پاسبانی ہوتی رہے، یہ اس تحریک کو چلانے کے لیے کوئی مفید صورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ اس راہ پر چلنے کے لیے مستقل طور پر کسی حرکت اور ہدایت دینے والے کے محتاج رہیں گے اور اگر کسی وقت وہ ہٹ گیا تو اُلٹے پاؤں پھر جائیں گے۔ کم از کم ہمارے ابتدائی کارکن جو سابقین اولین کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی تو یہ صفت ہونی چاہیے کہ ان میں سے ہر شخص کے اندر یہ داعیہ موجود ہو کہ اگر کوئی اس راہ پر چلنے والا نہ ہو تو نہ صرف وہ خود حرکت کریں گے بلکہ دوسروں کو بھی حرکت دیں گے"۔

"منجملہ ان غلط فہمیوں کے جو آج کل عام طور پر پھیلی ہوئی ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں میں بعض مخصوص طرز کے کاموں کی اہمیت کا ایک غیر مناسب تصور پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ بس ہر شخص اسی طرز کے کام کرے، اور لفظ "کام" کے معنی ہی یہ سمجھ جاتے ہیں کہ ہو تو بس وہی کام ہو مثلاً دیہات کا چکر لگانا یا عوام میں دعوت پھیلانا وغیرہ۔ اب قطع نظر اس کے کہ ہر شخص میں دیہاتیوں سے خطاب کرنے اور عوام کی اصلاح کرنے کی اہلیت ہو

یا نہ ہو، لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جو شخص بھی کام کرنے کے لیے اٹھے وہ یہی کام کرے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے کام جو اپنے وزن اور نتائج کے لحاظ سے دیہاتیوں کی اصلاح اور عمومی ۔ ر ن ت کچھ کم اہم نہیں ہیں بلکہ بہت زیادہ عظیم الشان ہیں، ان کی اہمیت کو نہیں سمجھا جاتا۔

میں دیکھتا ہوں کہ اس غلط تصورِ عمل سے ہمارے رفقاء بھی بہت کچھ متاثر ہیں اور بعض لوگوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ اپنی قابلیتوں کو سمجھے بغیر بس وہ کام کریں جسے دنیا الفظ کام سے تعبیر کرتی ہے۔ اس چیز کی غلطی اچھی طرح سمجھ لیجیے اور اس میں مبتلا ہونے سے بچیے۔

دراصل اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر شخص سے اس عبادت کا مطالبہ کرتا ہے جس کی صلاحیت اس نے اس کے اندر ودیعت کی ہے۔ جو جو قوتیں اللہ نے کسی شخص کو تفویض کی ہیں ان ساری قوتوں سے اس کو عبادت بجا لانی چاہیے اور جو خاص قوت کسی کو زیادہ عطا فرمائی ہے اس پر عبادت کا حق بھی بہ نسبت دوسری قوتوں کے زیادہ عائد ہوتا ہے مثلاً اگر کسی شخص کو اللہ نے گویائی کی قوت زیادہ عطا کی ہو تو اس کے لیے اصل عبادت یہی ہوگی کہ اپنی زبان کو اعلائے کلمۃ اللہ کی خدمت میں استعمال کرے اور جسے تحریر کی نمایاں صلاحیت بخشی گئی ہو سب سے زیادہ اس کے قلم ہی پر فرائض عبودیت عائد ہوں گے۔ غرض ہر شخص کے ذمہ وہی کام ہے جس کی قوت خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے اسے ودیعت کی ہو۔ اگر وہ اس کام کو چھوڑ کر کسی دوسرے ایسے کام میں اپنی قوتیں صرف کرتا ہے جس کی اہمیت اس میں نسبتاً کم ہے تو وہ اجر کا مستحق نہیں بلکہ اس کے مبتلائے وزر ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

جب اللہ کے دین کی خدمت کے بے شمار پہلو ہیں اور ہر پہلو ایک اہمیت رکھتا ہے تو اشخاص کی مساعی کو کسی ایک دائرہ میں سمیٹنا قطعاً غلط ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم تعلیم و تدریس کے ماہرین، مصنفین، اہلِ صحافت، سب کو دیہات میں کام کرنے کے لیے بھیج دیں۔ ایسا ہی ایک تجربہ اشتراکی انقلاب کے علمبرداروں نے ابتداءً روس میں کیا تھا۔ انھوں نے اہلِ دماغ کا ایک بڑا لشکر مزدوروں اور کسانوں میں کام کرنے کے لیے پھیلا دیا لیکن کثیر لوگوں کی زندگیاں ایک غلط مصرف پر صرف کر دینے کے بعد معلوم ہوا کہ جو کچھ ہوا ہے غلط ہوا ہے۔ (باقی مضمون صفحہ ۳۰۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

تفہیم القرآن

(۱۴)

الانعام

(از رکوع ۶ تا وسط رکوع ۱۶)

اور اے محمد! تم اِس (علمِ وحی) کے ذریعہ سے اُن لوگوں کو نصیحت کرو جو اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کیے جائیں گے کہ اُس کے سوا وہاں کوئی (ایسا ذی اقتدار) نہ ہوگا جو ان کا حامی و مددگار ہو یا ان کی سفارش کرے، شاید کہ (اس نصیحت سے متنبہ ہو کر) وہ خدا ترسی کی روش اختیار کرلیں۔[سلہ] اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انھیں اپنے سے دور نہ پھینکو،[ﷲ] اُن کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے اور تمھارے حساب میں سے

سلہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی میں ایسے مدہوش ہیں کہ انہیں نہ موت کی فکر ہے نہ یہ خیال ہے کہ کبھی ہمیں اپنے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے اُن پر تو یہ نصیحت ہرگز کارگر نہ ہوگی۔ اور اسی طرح ان لوگوں پر بھی اس کا کچھ اثر نہ ہوگا جو اس بے بنیاد بھروسہ پر جی رہے ہیں کہ دنیا میں ہم جو چاہیں کر گذریں، آخرت میں ہمارا بال تک بیکا نہ ہوگا کیونکہ ہم فلاں کے دامن گرفتہ ہیں، یا فلاں ہماری سفارش کردے گا یا فلاں ہمارے لیے کفارہ بن چکا ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو چھوڑ کر تم اپنا روئے سخن ان لوگوں کی طرف رکھو جو خدا کے سامنے حاضری کا بھی اندیشہ رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ جھوٹے بھروسوں پر پھولے ہوئے بھی نہ ہوں۔ اس نصیحت کا اثر صرف ایسے ہی لوگوں پر ہو سکتا ہے اور انہی کے درست ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

ﷲ قریش کے بڑے بڑے سرداروں اور کھاتے پیتے لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر منجملہ اور اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آپ کے گرد پیش ہماری قوم کے غلام، موالی اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ اس شخص کو ساتھی بھی کیسے کیسے معزز لوگ ملے ہیں، بلال، عمار، صہیب، اور خباب۔ بس یہی لوگ اللہ کو ہمارے درمیان ایسے ملے جن کو برگزیدہ کیا جا سکتا تھا! پھر وہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

کسی چیز کا بار ان پر نہیں، اس پر بھی اگر تم انھیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہوگے۔ دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ سے آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ وہ انھیں دیکھ کر کہیں "کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے؟" ـــــ ہاں! کیا خدا اپنے شکر گذار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ہے؟ جب تمھارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہو "تم پر سلامتی ہے، تمھارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے، اور یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی برائی کا ارتکاب کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو وہ معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے" ـــــ اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے۔ ع

اے محمد! ان سے کہو کہ تم لوگ اللہ کے سوا جن دوسروں کو پکارتے ہو ان کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔ کہو میں تمھاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا، اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا، راہ راست

(بقیہ سابق) ان ایمان لانے والوں کی خستہ حالی کا مذاق اڑانے پر ہی اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ان میں سے جن جس سے کبھی پہلے کوئی اخلاقی کمزوری ظاہر ہوئی تھی اس پر بھی حرف گیریاں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ فلاں جو کل تک یہ تھا اور فلاں جس نے یہ کیا تھا آج وہ بھی اس "برگزیدہ گروہ" میں شامل ہے۔ انہی باتوں کا جواب یہاں دیا جا رہا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ یعنی ہر شخص اپنے عیب و صواب کا ذمہ دار آپ ہی ہے۔ ان مسلمان ہونے والوں میں سے کسی شخص کی جوابدہی کے لیے تم کھڑے نہ ہوگے اور نہ تمھاری جوابدہی کے لیے ان میں سے کوئی کھڑا ہوگا۔ تمھارے حصہ کی کوئی نیکی یہ تم سے چھین نہیں سکتے اور اپنے حصہ کی کوئی بدی تم پر ڈال نہیں سکتے۔ پھر جب یہ محض طالب حق بن کر تمھارے پاس آتے ہیں تو آخر تم کیوں انھیں اپنے سے دور پھینکو۔

سلہ یعنی غریبوں اور مفلسوں اور ایسے لوگوں کو جو سوسائٹی میں ادنیٰ حیثیت رکھتے ہیں، سب سے پہلے ایمان کی توفیق دے کر ہم نے دولت اور عزت کا گھمنڈ رکھنے والے لوگوں کو آزمائش میں ڈال دیا ہے۔

سلہ "اس طرح" کا اشارہ اس پورے سلسلۂ تقریر کی طرف ہے جو چوتھے رکوع کی اس آیت سے شروع ہوا تھا: "یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشانی کیوں نہیں اتری" مطلب یہ ہے کہ ایسی صاف اور صریح دلیلوں اور نشانیوں کے بعد بھی جو لوگ اپنے کفر و انکار پر

(باقی اگلے صفحہ پر)

پانے والوں میں سے نہ رہا. کہو، میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے، اب میرے اختیار میں وہ چیز نہیں جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو[1]۔ فیصلہ کا سارا اختیار اللہ کو ہے، وہی امر حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہو، اگر کہیں وہ چیز میرے اختیار میں ہوتی جس کی تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، مگر اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہیئے۔ اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے، درخت سے گرنے والا کوئی پتہ ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو، زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو، خشک و تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے، پھر دوسرے روز وہ تمہیں اسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے تاکہ زندگی کی مقرر مدت پوری ہو۔ آخر کار اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے، پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ اپنے بندوں پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے بھیجتا ہے[2] یہاں

(بقیہ سابق) اصرار ہی کیے چلے جائیں ان کا مجرم ہونا بالکل غیر مشتبہ طور پر ثابت ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت بالکل آئینہ کی طرح نمایاں ہو جاتی ہے کہ دراصل یہ لوگ ضلالت پسندی کی بنا پر یہ راہ چل رہے ہیں نہ اس بنا پر کہ راہ حق کے دلائل واضح نہیں ہیں یا یہ کہ کچھ دلیلیں ان کی اس گمراہی کے حق میں بھی موجود ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اشارہ ہے عذاب الٰہی کی طرف۔ مخالفین کہتے تھے کہ اگر تم خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے نبی ہو اور ہم کھلم کھلا تم کو جھٹلا رہے ہیں تو کیوں نہیں خدا کا عذاب ہم پر ٹوٹ پڑتا؟ تمہارے مامور من اللہ ہونے کا اقتضا تو یہ تھا کہ ادھر کوئی تمہاری تکذیب یا توہین کرتا اور ادھر فوراً زمین دھنستی اور وہ اس میں سما جاتا یا بجلی گرتی اور وہ بھسم ہو جاتا۔ یہ کیا ہے کہ خدا کا فرستادہ اور اس پر ایمان لانے والے تو مصیبتوں پر مصیبتیں اور ذلتوں پر ذلتیں سہ رہے ہیں اور ان کو گالیاں دینے اور پتھر مارنے والے چین کیے جاتے ہیں؟

[2] یعنی ایسے فرشتے جو تمہاری ایک ایک جنبش اور ایک ایک بات پر نگاہ رکھتے ہیں اور تمہاری ہر ہر حرکت کا ریکارڈ محفوظ کرتے رہتے ہیں۔

تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنے کام میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر سب کے سب اپنے حقیقی آقا کی طرف واپس لائے جاتے ہیں۔ خبردار ہو جاؤ، فیصلہ کے سارے اختیارات اسی کو حاصل ہیں اور وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔

اے محمدؐ! ان سے پوچھو، صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں کون تمھیں خطرات سے بچاتا ہے؟ کون ہے جس سے تم (مصیبت کے وقت) گڑگڑا گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعائیں مانگتے ہو؟ کس سے کہتے ہو کہ اگر اس بلا سے تو نے ہم کو بچا لیا تو ہم ضرور شکر گزار ہوں گے؟ — کہو، اللہ تمھیں اس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے پھر تم دوسروں کو اس کا شریک ٹھیراتے ہو؎۔ کہو، وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اوپر سے نازل کر دے، یا تمھارے قدموں کے نیچے سے برپا کر دے، یا تمھیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طاقت کا مزہ چکھا دے۔ دیکھو، ہم کس طرح بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں شاید کہ یہ حقیقت کو سمجھ لیں؎۔ تمھاری

؎ یعنی یہ حقیقت کہ تنہا اللہ ہی قادرِ مطلق ہے اور وہی تمام اختیارات کا مالک اور تمھاری بھلائی اور برائی کا مختارِ کل ہے اور اسی کے ہاتھ میں تمھاری قسمتوں کی باگ ڈور ہے، اس کی شہادت تمھارے اپنے نفس میں موجود ہے چنانچہ جب کوئی سخت وقت آتا ہے اور اسباب کے سررشتے ٹوٹتے نظر آتے ہیں تو اس وقت تم بے اختیار اُسی کی طرف رجوع کرتے ہو لیکن اس کھلی علامت کے ہوتے ہوئے بھی تم نے خدائی میں بلا دلیل وحجت اور بلا ثبوت دوسروں کو اس کا شریک بنا رکھا ہے۔ پلتے ہو اس کے رزق پر اور اَن داتا بناتے ہو دوسروں کو۔ مدد پاتے ہو اس کے فضل وکرم سے اور حامی وناصر ٹھیراتے ہو دوسروں کو۔ غلام ہو اس کے اور بندگی بجا لاتے ہو دوسروں کی۔ مشکل کشائی کرتا ہے وہ، بُرے وقت پر گڑگڑاتے ہو اس کے آگے، اور جب وہ وقت گزر جاتا ہے تو تمھارے مشکل کشا بن جاتے ہیں دوسرے اور نذریں اور نیازیں چڑھنے لگتی ہیں ان کے نام کی۔

؎ جو لوگ عذابِ الٰہی کو اپنے سے دور پا کر حق دشمنی میں جرأت پر جرأت دکھا رہے تھے انھیں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ کے عذاب کو آتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ہوا کا ایک طوفان تمھیں اچانک برباد کر سکتا ہے۔ زلزلے کا ایک جھٹکا تمھاری بستیوں کو پیوندِ خاک کر دینے کے لیے کافی ہے۔ قبائلی اور قومی اختلافات کے میگزین میں ایک چنگاری وہ تباہی پھیلا سکتی ہے کہ سالہا سال تک خونریزی و بدامنی سے نجات نہ ملے پس اگر عذاب نہیں آ رہا ہے تو یہ تمھارے لیے غفلت و مدہوشی کی پینک نہ بن جانی چاہیے کہ مطمئن ہو کر صحیح و غلط کا امتیاز کیے بغیر اندھوں کی طرح زندگی کے راستے پر چلتے رہو۔ غنیمت سمجھو کہ اللہ تمھیں مہلت دے رہا ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

تو م اس کا انکار کر رہی ہے حالانکہ وہ حقیقت ہے۔ ان سے کہدو کہ میں تم پر حوالہ دار نہیں بنایا گیا ہوں[۱]، ہر خبر کے ظہور میں آنے کا ایک وقت مقرر ہے، عنقریب تم کو خود انجام معلوم ہو جائے گا۔

اور اے محمد! جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں، اور اگر کبھی شیطان تمھیں بھلاوے میں ڈال دے[۲] تو جس وقت تمھیں اس غلطی کا احساس ہو اس کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے پاس نہ بیٹھو۔ اُن کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری پرہیزگار لوگوں پر نہیں ہے، البتہ نصیحت کرنا ان کا فرض ہے شاید کہ وہ غلط روی سے بچ جائیں[۳]۔ چھوڑو ان لوگوں کو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور جنھیں دنیا کی زندگی فریب میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ ہاں مگر یہ قرآن سنا کر نصیحت اور تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کیے کرتوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے، اور گرفتار بھی اس حال میں کہ اللہ سے بچانے والا کوئی حامی و مددگار اور کوئی سفارشی

(بقیہ سابق) اور وہ نشانیاں تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے جس سے تم حق کو پہچان کر صحیح راستہ اختیار کر سکو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو کچھ تم نہیں دیکھ رہے ہو وہ زبردستی تمھیں دکھاؤں اور جو کچھ تم نہیں سمجھ رہے ہو وہ بزور تمھاری سمجھ میں اتار دوں۔ اور میرا یہ کام بھی نہیں ہے کہ اگر تم نہ دیکھو اور نہ سمجھو تو تم پر عذاب نازل کر دوں۔ میرا کام صرف حق اور باطل کو ممیز کر کے تمھارے سامنے پیش کر دینا ہے۔ اب اگر تم نہیں مانتے تو جس برے انجام سے میں تمھیں ڈراتا ہوں وہ اپنے وقت پر خود تمھارے سامنے آجائے گا۔

[۲] یعنی اگر ہماری یہ ہدایت تمھیں یاد نہ رہے اور بھولے سے تم ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھے رہ جاؤ۔

[۳] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی نافرمانی سے خود بچ کر کام کرتے ہیں ان پر نافرمانوں کے کسی عمل کی ذمہ داری نہیں ہے، پھر وہ کیوں خواہ مخواہ اس بات کو اپنے اوپر فرض کر لیں کہ ان نافرمانوں سے بحث و مناظرہ کر کے ضرور انھیں قائل کر کے ہی چھوڑیں گے اور ان کے ہر لغو و مہمل اعتراض کا جواب ضرور ہی دیں گے اور اگر وہ نہ مانتے ہوں تو کسی نہ کسی طرح منوا کر ہی رہیں گے۔ ان کا فرض بس اتنا ہے کہ جنھیں گمراہی میں بھٹکتے دیکھ رہے ہوں انھیں نصیحت کریں اور حق بات ان کے سامنے پیش کر دیں۔ پھر اگر وہ نہ مانیں اور جھگڑے اور بحث و حجت بازیوں پر اتر آئیں تو اہل حق کا یہ کام نہیں ہے کہ ان کے ساتھ دماغی کشتیاں لڑنے میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں ضائع کریں، ضلالت پسند لوگوں کے بجائے انھیں اپنے وقت اور اپنی قوتوں کو ان لوگوں کی اصلاح پر صرف کرنا چاہیے جو خود طالب حق ہوں۔

اس کے لیے نہ ہو اور اگر وہ ہر ممکن چیز فدیہ میں دے کر چھوٹنا چاہے تو وہ بھی اس سے قبول نہ کی جائے، کیونکہ ایسے لوگ تو خود اپنی کمائی کے نتیجہ میں پکڑے جائیں گے، ان کو تو اپنے انکارِ حق کے معاوضہ میں کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب بھگتنے کو ملے گا۔ ع

اے محمد! ان سے پوچھو کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر اُن کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان؟ اور جبکہ اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اب ہم اُلٹے پاؤں پھر جائیں؟ کیا ہم اپنا حال اُس شخص کا سا کر لیں جسے شیطانوں نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و سرگرداں پھر رہا ہو درآں حالے کہ اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ ادھر آ یہ سیدھی راہ موجود ہے؟ کہو حقیقت میں صحیح رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے اور اُس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ مالکِ کائنات کے آگے سرِ اطاعت خم کر دو، نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو، اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے، وہی ہے جس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے[1] اور جس دن وہ کہے گا کہ حشر ہو جائے اسی دن وہ ہو جائے گا، اس کا

---

[1] قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے یا حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ ارشاد بہت وسیع معانی پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تخلیق محض کھیل کے طور پر نہیں ہوئی ہے، یہ ایشور جی کی لیلا نہیں ہے، یہ کسی بچے کا کھلونا نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لیے وہ اس سے کھیلتا رہے اور پھر یونہی نسے توڑ پھوڑ کر پھینک دے۔ دراصل یہ ایک نہایت سنجیدہ کام ہے جو حکمت کی بنا پر کیا گیا ہے، ایک مقصدِ عظیم اس کے اندر کارفرما ہے، اور اس کا ایک دور گزر جانے کے بعد ناگزیر ہے کہ خالق اس پورے کام کا حساب لے جو اس دور میں انجام پایا ہے اور اسی دور کے نتائج پر دوسرے دور کی بنیاد رکھے یہی بات ہے جو دوسرے مقامات پر یوں بیان کی گئی ہے: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ "اے ہمارے رب، تو نے یہ سب کچھ فضول پیدا نہیں کیا ہے۔" اور وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ "ہم نے آسمان و زمین اور ان چیزوں کو جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے۔" اور اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ "تو کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں یونہی فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف واپس نہ لائے جاؤ گے؟"

اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے یہ سارا نظامِ کائنات حق کی ٹھوس بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ عدل اور حکمت اور راستی کے قوانین پر اس کی ہر چیز مبنی ہے۔ باطل کے لیے فی الحقیقت اس نظام میں جڑ پکڑنے اور بارآور ہونے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ باطل پرستوں کو موقع دیدے کہ وہ اگر اپنے جھوٹ اور ظلم اور ناراستی کو فروغ دینا چاہتے ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

ارشاد میں حق ہے، اور جس روز صور پھونکا جائے گا[۵۱] اس روز پادشاہی اسی کی ہوگی[۵۲]، وہ غیب اور شہادت[۵۳] ہر چیز کا عالم ہے اور دانا اور باخبر ہے۔

ابراہیم کا واقعہ یاد کرو[۵۴] جب اس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا "کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تو تجھے

(بقیہ سابق) تو اپنی کوشش کر دیکھیں، لیکن آخر کار زمین باطل کے ہر بیج کو اگل کر پھینک دے گی اور آخری فرد حساب میں ہر باطل پرست دیکھ لے گا کہ جو کوششیں اس نے اس شجر خبیث کی کاشت اور آبیاری میں صرف کیں وہ سب ضائع ہوگئیں۔ اس کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اس ساری کائنات کو بربنائے حق پیدا کیا ہے اور اپنے ذاتی حق کی بنا پر وہ فرمانروائی کر رہا ہے۔ اس کا حکم یہاں اس لیے چلتا ہے کہ وہی اپنی پیدا کی ہوئی کائنات میں حکمرانی کا حق رکھتا ہے، اور دوسروں کا حکم اگر بظاہر چلتا نظر بھی آتا ہو تو اس سے دھوکا نہ کھاؤ، فی الحقیقت نہ ان کا حکم چلتا ہے، نہ چل سکتا ہے، کیونکہ کائنات کی کسی چیز پر بھی ان کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اس پر اپنا حکم چلائیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] صور پھونکنے کی صحیح کیفیت کیا ہوگی، اس کی تفصیل ہمارے [illegible] ہے۔ قرآن سے جو کچھ ہمیں معلوم ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ قیامت کے روز اللہ کے حکم سے ایک مرتبہ صور پھونکا جائے گا اور سب ہلاک ہو جائیں گے، پھر نہ معلوم کتنی مدت بعد جسے اللہ ہی جانتا ہے، دوسرا صور پھونکا جائے گا اور تمام اولین و آخرین ازسرنو زندہ ہو کر اپنے آپ کو میدان حشر میں پائیں گے۔ پہلے صور پر سارا نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا اور دوسرے صور پر ایک دوسرا نظام نئی صورت اور نئے قوانین کے ساتھ قائم ہو جائے گا۔

[۵۲] یہ مطلب نہیں ہے کہ آج پادشاہی اس کی نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس روز جب پردہ اٹھایا جائے گا اور حقیقت بالکل سامنے آجائے گی تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ سب جو بااختیار نظر آتے تھے یا سمجھے جاتے تھے، بالکل بے اختیار ہیں اور پادشاہی کے سارے اختیارات اسی ایک خدا کے لیے ہیں جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔

[۵۳] غیب = وہ سب کچھ جو مخلوقات سے پوشیدہ ہے۔

شہادت = وہ سب کچھ جو مخلوقات کے لیے ظاہر و معلوم ہے۔

[۵۴] یہاں حضرت ابراہیم کے واقعہ کا ذکر اس امر کی تائید اور شہادت میں پیش کیا جا رہا ہے کہ جس طرح اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت سے آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے ساتھیوں نے شرک کا انکار کیا ہے اور سب مصنوعی خداؤں سے (باقی اگلے صفحہ پر)

اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں"۔ ابراہیم کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظامِ سلطنت دکھاتے تھے[۵۱] اور اس لیے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے[۵۲]۔ چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے۔ مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب۔ مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب، یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیم

(بقیہ سابق) منہ موڑ کر صرف ایک مالکِ کائنات کے آگے سرِ اطاعت خم کر دیا ہے اسی طرح کل یہی کچھ ابراہیم علیہ السلام بھی کر چکے ہیں؛ اور جس طرح آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والوں سے ان کی جاہل قوم جھگڑ رہی ہے اسی طرح کل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی ان کی قوم یہی جھگڑا کر چکی ہے، اور کل جو جواب حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کو دیا تھا آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیروؤں کی طرف سے ان کی قوم کو بھی وہی جواب ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس راستہ پر ہیں جو نوحؑ اور ابراہیمؑ اور نسلِ ابراہیمی کے تمام انبیاء کا راستہ رہا ہے۔ اب جو لوگ ان کی پیروی سے انکار کر رہے ہیں انھیں معلوم ہو جانا چاہیے کہ وہ انبیاء کے طریقہ سے ہٹ کر ضلالت کی راہ پر جا رہے ہیں۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ کفارِ عرب بالعموم حضرت ابراہیم کو اپنا پیشوا اور مقتدا مانتے تھے اور خصوصاً قریش کے تو فخر و ناز کی ساری بنیاد ہی یہ تھی کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ان کے تعمیر کردہ خانۂ خدا کے خادم ہیں۔ اس لیے ان کے سامنے حضرت ابراہیم کے عقیدۂ توحید اور شرک سے ان کے انکار، اور مشرک قوم سے ان کی نزاع کا ذکر کرنے کے معنی یہ تھے کہ قریش کا سارا سرمایۂ فخر و ناز اور کفارِ عرب کا اپنے مشرکانہ دین پر سارا اطمینان اُن سے چھین لیا جائے، اور اُن پر ثابت کر دیا جائے کہ آج مسلمان اس مقام پر ہیں جس پر حضرت ابراہیم تھے اور تمہاری حیثیت وہ ہے جو حضرت ابراہیم سے لڑنے والی جاہل قوم کی تھی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدوں اور قادری النسب پیرزادوں کے سامنے حضرت شیخ کی اصل تعلیمات اور اُن کی زندگی کے واقعات پیش کر کے یہ ثابت کر دے کہ جس بزرگ کے تم نام لیوا ہو، تمہارا اپنا طریقہ ان کے بالکل خلاف ہے اور تم نے آج انہی گمراہ لوگوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے جن کے خلاف تمہارے مقتدا تمام عمر جہاد کرتے رہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] یعنی جس طرح تم لوگوں کے سامنے آثارِ کائنات نمایاں ہیں اور اللہ کی نشانیاں تمہیں دکھائی جا رہی ہیں اسی طرح ابراہیم کے سامنے بھی یہی آثار تھے اور یہی نشانیاں تھیں۔ مگر تم انہیں دیکھنے پر بھی اندھوں کی طرح کچھ نہیں دیکھتے اور ابراہیم نے

(باقی اگلے صفحہ پر)

(حواشی صفحہ سابق) انھیں آنکھیں کھول کر دیکھا، یہی سورج اور چاند اور تارے جو تمھارے سامنے طلوع و غروب ہوتے ہیں اور روزانہ تم کو جیسا گمراہ طلوع ہوتے وقت پاتے ہیں ویسا ہی غروب ہوتے وقت چھوڑ جاتے ہیں، انہی کو اس آنکھوں والے انسان نے بھی دیکھا تھا اور انہی نشانات سے وہ حقیقت تک پہنچ گیا۔

۵۵ اس مقام کو اور قرآن کے دوسرے مقامات کو جہاں حضرت ابراہیم سے ان کی قوم کی نزاع کا ذکر آیا ہے، اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ حضرت ابراہیم کی قوم کے مذہبی و تمدنی حالات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ جدید اثری تحقیقات کے سلسلہ میں نہ صرف وہ شہر دریافت ہوگیا ہے جہاں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے تھے، بلکہ دورِ ابراہیمی میں اس علاقے کے لوگوں کی جو حالت تھی اس پر بھی بہت کچھ روشنی پڑی ہے۔ سر لیونارڈ وُولی (Sir Leonard Woolley) نے اپنی کتاب ("Abraham," London, 1935.) میں اس تحقیقات کے جو نتائج شائع کیے ہیں ان کا خلاصہ ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ سنہ ۲۱۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں، جسے اب عام طور پر محققین حضرت ابراہیم کے ظہور کا زمانہ تسلیم کرتے ہیں، شہر اُر کی آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب تھی اور بعید نہیں کہ پانچ لاکھ ہو۔ بڑا صنعتی و تجارتی مرکز تھا۔ ایک طرف پامیر اور نیلگری تک سے مال آتا تھا اور دوسری طرف اناطولیہ تک سے اس کے تجارتی تعلقات تھے جس ریاست کا یہ صدر مقام تھا اس کے حدود موجودہ حکومتِ عراق سے شمال میں کچھ کم اور مغرب میں کچھ زیادہ تھے۔ ملک کی آبادی بیشتر صنعت و تجارت پیشہ تھی۔ اس عہد کی جو تحریرات آثارِ قدیمہ کے کھنڈروں میں دستیاب ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں ان لوگوں کا نقطۂ نظر خالص مادہ پرستانہ تھا۔ دولت کمانا اور زیادہ سے زیادہ آسائش فراہم کرنا ان کا سب سے بڑا مقصدِ حیات تھا۔ سود خواری کثرت سے پھیلی ہوئی تھی۔ سخت کاروباری قسم کے لوگ تھے۔ ہر ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور آپس میں بہت مقدمہ بازیاں ہوتی تھیں۔ اپنے خداؤں سے ان کی دعائیں زیادہ تر درازیٔ عمر، خوش حالی، اور کاروبار کی ترقی سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ آبادی تین طبقوں پر مشتمل تھی۔ عمیلو، یہ اونچے طبقے کے لوگ تھے جن میں پجاری، حکومت کے عہدہ دار اور فوجی افسر وغیرہ شامل تھے۔ مشکینو، یہ تجار، اہل صنعت اور زراعت پیشہ لوگ تھے۔ اَردو، یعنی غلام۔ ان میں سے پہلے طبقہ، یعنی عمیلو کو خاص امتیازات حاصل تھے۔ ان کے فوجداری اور دیوانی حقوق دوسروں سے مختلف تھے، اور ان کی جان و مال کی قیمت دوسروں سے بڑھ کر تھی۔

اُر کے کتبات میں تقریباً ۵ ہزار خداؤں کے نام ملتے ہیں۔ ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ خدا تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص محافظ خدا ہوتا تھا جو ربّ البلد سمجھا جاتا تھا اور اس کا احترام دوسرے معبودوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

(حاشیہ صفحہ سابق) اُر کا ربّ البلد، جہاد یوتا جس کا نام "نَنّار" (چاند دیوتا) تھا اور اسی مناسبت سے بعد کے لوگوں نے اس شہر کا نام "قمرینہ" بھی لکھا ہے۔ دوسرا بڑا شہر لرسہ تھا جو بعد میں اُر کے بجائے مرکز سلطنت ہوا۔ اس کا ربّ البلد "شماش" (سورج دیوتا) تھا۔ ان بڑے خداؤں کے ماتحت بہت سے چھوٹے خدا بھی تھے جو زیادہ تر آسمانی تاروں اور سیاروں میں سے اور کم تر زمین سے منتخب کیے گئے تھے اور لوگ اپنی مختلف فروعی ضروریات ان سے متعلق سمجھتے تھے۔ ان آسمانی اور زمینی دیوتاؤں اور دیویوں کی شبیہیں بتوں کی شکل میں بنائی گئی تھیں اور تمام مراسم عبادت انہی کے آگے بجا لائے جاتے تھے۔

"نَنّار" کا بُت اُر میں سب سے اونچی پہاڑی پر ایک عالی شان عمارت میں نصب تھا۔ اسی کے قریب "نَنّار" کی بیوی "نِن گل" کا معبد تھا۔ نَنّار کے معبد کی شان ایک شاہی محل سرا کی سی تھی۔ اس کی خواب گاہ میں روزانہ رات کو ایک پوجارن جا کر اس کی دلہن بنتی تھی۔ مندر میں بکثرت عورتیں دیوتا کے نام پر وقف تھیں اور ان کی حیثیت دیوداسیوں کی سی تھی۔ وہ عورت بڑی معزز خیال کی جاتی تھی جو "خدا" کے نام پر اپنی بکارت قربان کر دے۔ اور کم از کم ایک مرتبہ اپنے آپ کو "راہِ خدا" میں کسی اجنبی کے حوالہ کرنا عورت کے لیے ذریعۂ نجات خیال کیا جاتا تھا۔ اب یہ بیان کرنا کچھ ضروری نہیں کہ اس مذہبی قحبہ گری سے مستفید ہونے والے زیادہ تر پوجاری حضرات ہی ہوتے تھے۔

نَنّار محض دیوتا ہی نہ تھا بلکہ ملک کا سب سے بڑا زمیندار، سب سے بڑا تاجر، سب سے بڑا کارخانہ دار اور ملک کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا حاکم بھی تھا۔ بکثرت باغ، مکانات، اور زمینیں اس کے مندر کے لیے وقف تھیں اور ان کے حاصلات کے علاوہ کسان، زمیندار، تجار سب ہر قسم کے غلے، دودھ، سونا، کپڑا اور دوسری چیزیں لا کر مندر میں نذر بھی کرتے تھے جنہیں وصول کرنے کے لیے معبد میں ایک بہت بڑا اسٹاف موجود تھا۔ بہت سے کارخانے مندر کے ماتحت قائم تھے۔ تجارتی کاروبار بھی بہت بڑے پیمانے پر مندر کی طرف سے ہوتا تھا اور یہ دونوں کام دیوتا کی نیابت میں پوجاری ہی انجام دیتے تھے۔ پھر ملک کی سب سے بڑی عدالت مندر ہی میں تھی۔ پوجاری اس کے جج تھے اور ان کے فیصلے "خدا" کے فیصلے سمجھے جاتے تھے۔ خود شاہی خاندان کی حاکمیت بھی نَنّار ہی سے ماخوذ تھی۔ اصل بادشاہ نَنّار تھا اور فرماں روائے ملک اس کی طرف سے حکومت کرتا تھا۔ اس تعلق سے بادشاہ خود بھی معبودوں میں شامل ہو جاتا تھا اور خداؤں کے مانند اس کی پرستش کی جاتی تھی۔

اُر کا شاہی خاندان جو حضرت ابراہیم کے زمانہ میں حکمراں تھا، اس کے بانی اول کا نام اُرنمّو تھا جس نے ۲۳۰۰ برس قبل مسیح میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ اس کے حدودِ مملکت مشرق میں سوسہ سے لے کر مغرب میں لبنان تک پھیلے ہوئے تھے۔ اسی سے اس خاندان کو "نمّو" کا نام ملا جو عربی میں جا کر "نمرود" ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد اس خاندان اور اس قوم پر مسلسل تباہی نازل ہونی شروع ہوئی۔ پہلے ایلامیوں نے اُر کو تباہ کیا اور نمرود کو نَنّار کے بُت سمیت (باقی اگلے صفحہ پر)

پکارا اٹھا[1] "اے میری قوم! میں اُن سب سے بیزار ہوں جنھیں تم خدا کا شریک ٹھیراتے ہو۔

(بقیہ سابق) پکڑ لے گئے۔ پھر لرسہ میں ایک ایلامی حکومت قائم ہوئی جس کے ماتحت اُر کا علاقہ غلام کی حیثیت سے رہا۔ آخر کار ایک عربی النسل خاندان کے ماتحت بابل نے زور پکڑا اور لرسہ و اُر دونوں اس کے زیر حکم ہوگئے۔ ان تباہیوں نے تنا کیسا اُر کے لوگوں کا عقیدہ متزلزل کر دیا کیونکہ وہ ان کی حفاظت نہ کر سکے تعین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بعد کے ادوار میں حضرت ابراہیم کی تعلیمات کا اثر اس ملک کے لوگوں نے کہاں تک قبول کیا لیکن سنہ ۲۱۰۰ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ حمورابی (حمّوربی) نے جو قوانین مرتب کیے تھے وہ شہادت دیتے ہیں کہ بالواسطہ یا بلا واسطہ ان کی تدوین میں مشکوٰۃ نبوت سے حاصل کی ہوئی روشنی کسی حد تک ضرور کار فرما تھی۔ ان قوانین کا مفصل کتبہ سنہ ۱۹۰۲ء بعد مسیح میں ایک فرانسیسی منقش آثار قدیمہ کو ملا اور اس کا انگریزی ترجمہ C. H. W. Johns نے ۱۹۰۳ء بعد مسیح میں The Oldest Code of Law کے نام سے شائع کیا۔ اس ضابطۂ قوانین کے بہت سے اصول اور فروع موسوی شریعت سے مشابہت رکھتے ہیں۔

یہ اب تک کی اثری تحقیقات کے نتائج اگر صحیح ہیں تو ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم کی قوم میں شرک محض ایک مذہبی عقیدہ اور بت پرستانہ عبادات کا مجموعہ ہی نہ تھا بلکہ درحقیقت اس قوم کی پوری معاشی، تمدنی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا نظام اسی عقیدے پر مبنی تھا، اور اس کے مقابلہ میں توحید کی جو دعوت حضرت ابراہیم نے دی اس کا اثر صرف بتوں کی پرستش ہی پر نہ پڑتا تھا بلکہ شاہی خاندان کی معبودیت اور حاکمیت، پوجاریوں اور اونچے طبقوں کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی حیثیت، اور پورے ملک کی اجتماعی زندگی اس کی زد میں آئی جاتی تھی (۳۱)، دعوت کو قبول کرنے کے معنی یہ تھے کہ نیچے سے اوپر تک ساری سوسائٹی کی عمارت ادھیڑ ڈالی جائے اور اسے از سر نو توحید الٰہ کی بنیاد پر تعمیر کیا جائے۔ اسی لیے ابراہیم علیہ السلام کی آواز بلند ہوتے ہی عوام اور خواص، پوجاری اور نمرود سب کے سب بیک وقت اس کو دبانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔

(حاشیہ صفحہ ۴۳۸) [1] یہاں حضرت ابراہیم کے اُس ابتدائی تفکر کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے ان کے لیے حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بنا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک صحیح الدماغ اور سلیم النظر انسان، جس نے سراسر شرک کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور جسے توحید کی تعلیم کہیں سے حاصل نہ ہو سکی تھی، کس طرح آثار کائنات کا مشاہدہ کر کے اور ان پر غور و فکر اور ان سے صحیح استدلال کر کے امر حق معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اوپر قوم ابراہیم کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان پر ایک نظر ڈال لینے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے جب ہوش سنبھالا تھا تو ان کے گرد و پیش ہر طرف چاند، سورج اور تاروں کی خدائی کے ڈنکے بج رہے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر حضرت ابراہیم کی جستجوئے حقیقت کا آغاز اسی سوال سے ہونا چاہیے تھا کہ کیا فی الواقع ان میں سے کوئی رب ہو سکتا ہے؟ اسی مرکزی سوال پر انھوں نے غور و فکر کیا اور آخر کار اپنی قوم کے سارے خداؤں کو ایک اٹل قانون کے تحت غلاموں کی طرح گردش کرتے دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ جن جن کے (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

(بقیہ حاشیہ سابق)

رب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے ان میں سے کسی کے اندر بھی ربوبیت کا شائبہ تک نہیں ہے، رب صرف وہی ایک ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا اور بندگی پر مجبور کیا۔

اس قصہ کے الفاظ سے عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ جب رات طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا، اور جب وہ ڈوب گیا تو یہ کہا، پھر چاند دیکھا اور جب وہ ڈوب گیا تو یہ کہا، پھر سورج دیکھا اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو یہ کہا، اس پر ایک عام ناظر کے ذہن میں فوراً یہ سوال کھٹکتا ہے کہ کیا بچپن سے آنکھ کھولتے ہی روزانہ حضرت ابراہیم پر رات طاری نہ ہوتی رہی تھی اور کیا وہ ہر روز چاند، تاروں اور سورج کو طلوع و غروب ہوتے نہ دیکھتے تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ غور و فکر تو انھوں نے سن رشد کو پہنچنے کے بعد ہی کیا ہوگا۔ پھر یہ قصہ اس طرح کیوں بیان کیا گیا ہے کہ جب رات ہوئی تو یہ دیکھا اور دن نکلا تو یہ دیکھا؟ گویا اس خاص واقعہ سے پہلے انھیں یہ چیزیں دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا، حالانکہ ایسا ہونا صریحاً مستبعد ہے۔ یہ شبہ بعض لوگوں کے لیے اس قدر ناقابلِ حل بن گیا کہ اسے دفع کرنے کی کوئی صورت انھیں اس کے سوا نظر نہ آئی کہ حضرت ابراہیم کی پیدائش اور پرورش کے متعلق ایک غیر معمولی قصہ تصنیف کریں اور اس سے یہ ثابت کریں کہ آنجناب کو قصداً ایک تاریک غار میں پرورش کیا گیا تھا جہاں سن رشد کو پہنچنے تک وہ چاند، تاروں اور سورج کے مشاہدے سے محروم رکھے گئے تھے۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے اس نوعیت کی کسی داستان کی ضرورت نہیں ہے۔ نیوٹن کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے باغ میں ایک سیب کو درخت سے گرتے دیکھا اور اس سے اس کا ذہن اچانک اس سوال کی طرف متوجہ ہو گیا کہ اشیاء آخر زمین پر ہی کیوں گرا کرتی ہیں، یہاں تک کہ غور کرتے کرتے وہ قانون جذب و کشش کے استنباط تک پہنچ گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس واقعہ سے پہلے نیوٹن نے کبھی کوئی چیز زمین پر گرتے نہیں دیکھی تھی؟ ظاہر ہے کہ ضرور دیکھی ہوگی اور بارہا دیکھی ہوگی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسی خاص تاریخ کو سیب گرنے کے مشاہدے سے نیوٹن کے ذہن میں وہ حرکت پیدا ہوئی جو اس سے پہلے روزمرہ کے ایسے سینکڑوں مشاہدات سے نہ ہوئی تھی؟ اس کا جواب اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہی کہ غور و فکر کرنے والا ذہن ہمیشہ ایک طرح کے مشاہدات سے ایک ہی طرح متاثر نہیں ہوا کرتا۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی، مگر ایک وقت اسی چیز کو دیکھ کر یکایک ذہن میں ایک کھٹک پیدا ہو جاتی ہے جس سے فکر کی قوتیں ایک خاص مضمون کی طرف کام کرنے لگتی ہیں، یا پہلے سے کسی سوال کی تحقیق میں ذہن الجھ رہا ہوتا ہے اور یکایک روزمرہ ہی کے مشاہدات میں سے کسی ایک چیز پر نظر پڑتے ہی گتھی کا وہ سرا ہاتھ لگ جاتا ہے جس سے ساری الجھنیں سلجھتی چلی جاتی ہیں۔ ایسا ہی

(باقی اگلے صفحہ پر)

میں نے تو یک سو ہو کر اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں"۔ اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی۔ اس نے کہا "کیا تم لوگ اللہ کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہ راست دکھا دی ہے۔ اور میں تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا، ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو وہ ضرور ہو سکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے، پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ اور آخر میں تمہارے

(بقیہ سابق) معاملہ حضرت ابراہیم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ راتیں روز آتی تھیں اور گذر جاتی تھیں، سورج اور چاند اور تارے سب ہی آنکھوں کے سامنے ڈوبتے اور ابھرتے رہتے تھے، لیکن وہ ایک خاص دن تھا جب ایک تارے کے مشاہدے نے ان کے ذہن کو اس راہ پر ڈال دیا جس سے بالآخر وہ توحید الٰہی کی مرکزی حقیقت تک پہنچ کر رہے۔ ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم کا ذہن پہلے سے اس سوال پر غور کر رہا ہو کہ جن عقائد پر ساری قوم کا نظام زندگی چل رہا ہے ان میں کس حد تک صداقت ہے، اور پھر ایک تارا یکایک سامنے آکر کشود کار کے لیے کلید بن گیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تارے کے مشاہدے ہی سے ذہنی حرکت کی ابتدا ہوئی ہو۔

اسی سلسلہ میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے تارے کو دیکھ کر کہا یہ میرا رب ہے اور جب چاند اور سورج کو دیکھ کر انھیں اپنا رب کہا، تو کیا وہ اس وقت عارضی طور پر ہی سہی، شرک میں مبتلا نہ ہو گئے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک طالب حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کے لیے ٹھیرتا ہے، اصل اعتبار ان کا نہیں ہوتا بلکہ اصل اعتبار اس سمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے اور اُس آخری منزل کا ہوتا ہے جہاں پہنچ کر وہ قیام کرتا ہے۔ بیچ کی منزلیں ہر جویائے حق کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان پر ٹھیرنا بسلسلۂ طلب و جستجو ہوتا ہے نہ کہ بصورت فیصلہ۔ اصلاً یہ ٹھیراؤ سوالی و استفہامی ہوا کرتا ہے نہ کہ حکمی۔ طالب جب ان میں سے کسی منزل پر رُک کر کہتا ہے کہ "ایسا ہے" تو در اصل یہ اس کی اختتامی رائے نہیں ہوتی بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "ایسا ہے؟" اور تحقیق سے اس کا جواب نفی میں پا کر وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اثنائے راہ میں جہاں جہاں وہ ٹھیرتا رہا وہاں وہ عارضی طور پر کفر یا شرک میں مبتلا رہا۔ اس کو حج کی مثال پر قیاس کرنا چاہیے کہ آدمی جب حج کی نیت سے نکل کھڑا ہوا تو وہ سبیل رب میں ہے اگرچہ وہ راستہ میں کعبہ سے ورے جگہ جگہ ٹھیرتا ہی جائے گا حتی کہ اس راہ میں اگر وہ کسی جگہ مر جائے تب بھی وہ حج کے ثواب سے محروم نہ رہے گا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ^۵۳^ اصل میں لفظ تذکّر استعمال ہوا ہے جس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص جو غفلت اور بھلاوے میں پڑا ہوا ہو وہ چونک کر اس چیز کو یاد کرے جس سے وہ غافل تھا۔ اسی لیے ہم نے اَفَلَا تَتَذَکَّرُوْنَ کا یہ ترجمہ کیا ہے۔ حضرت ابراہیم کے (باقی اگلے صفحہ پر)

ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جبکہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔ حقیقت میں تو امن انہی کے لیے ہے اور راہ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔[۵۵] ع

یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی، ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں، حق یہ ہے کہ تمھارا رب نہایت دانا اور علیم ہے۔

پھر ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو راہ راست دکھائی، (وہی راہ راست جو اس سے پہلے نوح کو دکھائی تھی۔) اور اسی کی نسل سے ہم نے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو (ہدایت

(بقیہ سابق) ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، تمھارا اصلی و حقیقی رب اس سے بے خبر نہیں ہے، اس کا علم ساری چیزوں پر وسیع ہے، پھر کیا اس حقیقت سے واقف ہو کر بھی تمھیں ہوش نہ آئے گا؟

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵۵ یہ پوری تقریر اس بات پر شاہد ہے کہ وہ قوم اللہ فاطر السموات والارض کی ہستی کی منکر نہ تھی بلکہ اس کا اصلی جرم اللہ کے ساتھ دوسروں کو خدائی صفات اور خداوندانہ حقوق میں شریک قرار دینا تھا۔ اول تو حضرت ابراہیم خود ہی فرما رہے ہیں کہ تم اللہ کے ساتھ دوسری چیزوں کو شریک کرتے ہو۔ دوسرے وہ جس طرح ان لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے اللہ کا ذکر کرتے ہیں، یہ انداز بیان صرف انہی لوگوں کے مقابلہ میں اختیار کیا جا سکتا ہے جو اللہ کے نفس وجود سے منکر نہ ہوں۔ لہٰذا ان مفسرین کی رائے درست نہیں ہے جنھوں نے اس مقام پر اور حضرت ابراہیم کے سلسلہ میں دوسرے مقامات پر قرآن کے بیانات کی تفسیر اس مفروضہ پر کی ہے کہ قوم ابراہیم اللہ کی منکر یا اس سے ناواقف تھی اور صرف اپنے معبودوں ہی کو خدائی کا بالکلیہ مالک سمجھتی تھی۔

آخری آیت میں یہ جو فقرہ ہے کہ "جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا"، اس میں لفظ ظلم سے بعض صحابہ کو غلط فہمی ہوئی تھی کہ شاید اس سے مراد معصیت ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصریح فرما دی کہ دراصل یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ لہٰذا اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اللہ کو مانیں اور اپنے اس ماننے کو کسی مشرکانہ عقیدہ و عمل سے آلودہ نہ کریں، امن صرف انہی کے لیے ہے اور وہی راہ راست پر ہیں۔

بخشی)، اس طرح ہم نیکو کاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں۔ (اسی کی اولاد سے) زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو (راہ یاب کیا) کہ ہر ایک ان میں سے صالح تھا۔ (اسی کے خاندان سے) اسماعیل، الیسع، اور یونس اور لوط کو (راستہ دکھایا) اور ان میں سے ہر ایک کو تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ نیز ان کے آباؤ اجداد اور ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا، انھیں اپنی خدمت کے لیے چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا۔[1] وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی[2]، اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پروا نہیں)، ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے منکر نہیں ہیں[3]۔ اے محمد! وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے، انھی کے راستہ پر تم چلو، اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ و ہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لیے۔

---

[1] یعنی جس شرک میں تم لوگ مبتلا ہو اگر کہیں وہ بھی اسی میں مبتلا ہوئے ہوتے تو یہ مرتبے ہرگز نہ پا سکتے۔ ممکن تھا کہ ان میں سے کوئی کامیاب ڈاکہ زنی کر کے فاتح کی حیثیت سے دنیا میں شہرت پا لیتا، یا زر پرستی میں کمال پیدا کر کے قارون کا سا نام پیدا کر لیتا، یا کسی اور صورت سے دنیا کے بدکاروں میں نامور بدکار بن جاتا، لیکن یہ امام ہدایت اور امام المتقین ہونے کا اور یہ دنیا بھر کے لیے خیر و صلاح کا سرچشمہ ہونے کا مقام تو کوئی بھی نہ پا سکتا اگر شرک سے مجتنب اور خالص خدا پرستی کی راہ پر ثابت قدم نہ ہوتا۔

[2] یہاں انبیاء علیہم السلام کو تین چیزیں عطا کیے جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک کتاب یعنی اللہ کا ہدایت نامہ۔ دوسرے حکم یعنی اس ہدایت نامہ کا صحیح فہم اور اس کے اصولوں کو معاملات زندگی پر منطبق کرنے کی صلاحیت اور مسائل حیات میں فیصلہ کن رائے قائم کرنے کی خداداد قابلیت۔ تیسرے نبوت یعنی یہ منصب کہ وہ اس ہدایت نامہ کے مطابق خلق اللہ کی رہنمائی کریں۔

[3] مطلب یہ ہے کہ اگر یہ کافر و مشرک اللہ کی اس ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں تو کر دیں، ہم نے

(باقی اگلے صفحہ پر)

اِن لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے[سلہ]۔ اِن سے پوچھو، پھر وہ کتاب جسے موسیٰ لایا تھا، جو تمام انسانوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی، جسے تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو، کچھ دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھپا جاتے ہو، اور جس کے ذریعہ سے تم کو وہ علم دیا گیا جو نہ تمھیں حاصل تھا اور نہ تمھارے باپ دادا کو، آخر اس کا نازل کرنے والا کون تھا[سمہ]؟ — بس اتنا کہدو کہ اللہ، پھر انھیں اپنی دلیل بازیوں سے کھیلنے کے لیے چھوڑ دو۔ (اُسی کتاب کی طرح) یہ ایک کتاب ہے

(بقیہ سابق) اہلِ ایمان کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا ہے جو اس نعمت کی قدر کرنے والا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ پچھلے سلسلۂ بیان اور بعد کی جوابی تقریر سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ یہ قول یہودیوں کا تھا چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ یہ تھا کہ میں نبی ہوں اور مجھ پر کتاب نازل ہوئی ہے، اس لیے قدرتی طور پر کفار قریش اور دوسرے مشرکین عرب اس دعوے کی تحقیق کے لیے یہود و نصاریٰ کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان سے پوچھتے تھے کہ تم بھی اہلِ کتاب ہو، پیغمبروں کو مانتے ہو، بتاؤ کیا واقعی اس شخص پر اللہ کا کلام نازل ہوا ہے؟ پھر جو کچھ جواب وہ دیتے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سرگرم مخالفین جگہ جگہ بیان کر کے لوگوں کو برگشتہ کرتے پھرتے تھے۔ اسی لیے یہاں یہودیوں کے اس قول کو، جسے مخالفین اسلام نے حجت بنا رکھا تھا، نقل کر کے اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک یہودی جو خود توراۃ کو خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب مانتا ہے، یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر بسا اوقات آدمی کسی دوسرے کی سچی باتوں کو رد کرنے کے لیے ایسی باتیں بھی کہہ جاتا ہے جن سے خود اس کی اپنی مسلمہ صداقتوں پر بھی زد پڑ جاتی ہے۔ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو رد کرنے پر تلے ہوئے تھے اور اپنی مخالفت کے جوش میں اس قدر اندھے ہو جاتے تھے کہ حضور کی رسالت کی تردید کرتے کرتے خود رسالت ہی کی تردید کر گذرتے تھے۔

اور یہ جو فرمایا کہ لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب یہ کہا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کی حکمت اور اس کی قدرت کا اندازہ کرنے میں غلطی کی ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر علمِ حق اور ہدایت نامۂ زندگی نازل نہیں کیا ہے وہ یا تو بشر پر نزولِ وحی کو ناممکن سمجھتا ہے اور یہ خدا کی قدرت کا غلط اندازہ ہے، یا پھر وہ یہ سمجھتا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

جسے ہم نے نازل کیا ہے، بڑی خیر و برکت والی ہے، اُس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھی، اور اس لیے نازل کی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے تم بستیوں کے اس مرکز (یعنی مکہ) اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو متنبہ کرو۔ جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں وہ اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔[۱] اور اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان

(بقیہ سابق) کہ خدا نے انسان کو ذہانت کے ہتھیار اور تصرف کے اختیارات تو دیے مگر اس کی صحیح رہنمائی کا کوئی انتظام نہ کیا بلکہ اُسے دنیا میں اندھا دھند کام کرنے کے لیے یونہی چھوڑ دیا، اور یہ خدا کی حکمت کا غلط اندازہ ہے۔

[۱] یہ جواب چونکہ یہودیوں کو دیا جا رہا ہے اس لیے موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ کے نزول کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے کیونکہ وہ خود اس کے قائل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ تسلیم کرنا کہ حضرت موسیٰ پر توراۃ نازل ہوئی تھی، ان کے اس قول کی آپ سے آپ تردید کر دیتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ نیز اس سے کم از کم اتنی بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ بشر پر خدا کا کلام نازل ہو سکتا ہے اور ہو چکا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] پہلی دلیل اس بات کے ثبوت میں تھی کہ بشر پر خدا کا کلام نازل ہو سکتا ہے اور عملاً ہوا بھی ہے۔ اب یہ دوسری دلیل اس بات کے ثبوت میں ہے کہ یہ کلام جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے، یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے چند باتیں شہادت کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ کتاب بڑی خیر و برکت والی ہے، یعنی اس میں انسان کی فلاح و بہبود کے لیے بہترین اصول پیش کیے گئے ہیں، عقائد صحیحہ کی تعلیم ہے، بھلائیوں کی ترغیب ہے، اخلاق فاضلہ کی تلقین ہے، پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ہدایت ہے، اور جہالت، خود غرضی، تنگ نظری، ظلم، فحش اور دوسری برائیوں میں سے کسی برائی کا اس میں شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ دوسرے یہ کہ اس سے پہلے خدا کی طرف سے جو ہدایت نامے آئے تھے یہ کتاب ان سے الگ ہٹ کر کوئی مختلف ہدایت پیش نہیں کرتی بلکہ اسی چیز کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو ان میں پیش کی گئی تھی۔ تیسرے یہ کہ یہ کتاب اسی مقصد کے لیے نازل ہوئی ہے جو ہر زمانہ میں اللہ کی طرف سے کتابوں کے نزول کا مقصد رہا ہے، یعنی غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانا اور کج روی کے انجامِ بد سے خبردار کرنا۔ چوتھے یہ کہ اس کتاب کی دعوت نے انسانوں کے گروہ میں سے ان لوگوں کو متاثر نہیں کیا جو دنیا پرست اور خواہشِ نفس کے بندے ہیں بلکہ متاثر انھیں کیا ہے جن کی نظر حیاتِ دنیا

(باقی اگلے صفحہ پر)

گھڑ لے[1]، یا کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے درآں حالیکہ اس پر کوئی وحی نازل نہ کی گئی ہو، یا جو اللہ کی نازل کردہ چیز کے مقابلہ میں کہے کہ میں بھی ایسی چیز نازل کر کے دکھا دوں گا؟ کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جب کہ وہ سکرات موت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ لاؤ، نکالو اپنی جان، آج تمھیں اُن باتوں کی پاداش میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے اور اس کی آیات کے مقابلہ میں سرکشی دکھاتے تھے۔ (اور اللہ فرمائیگا)

"لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمھیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا، جو کچھ ہم نے تمھیں دنیا میں دیا تھا وہ سب پیچھے چھوڑ آئے ہو، اور اب ہم تمھارے ساتھ تمھارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمھارے کام بنانے میں اُن کا بھی کچھ حصہ ہے۔ تمھارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گُم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے"۔ اع

دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے[2]، وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے خارج کرتا ہے[3]۔ یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے، پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو؟ پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے، اسی نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے، اسی نے چاند اور سورج کے طلوع

(بقیہ سابق) کی تنگ سرحدوں سے آگے تک جاتی ہے، اور پھر اس کتاب سے متاثر ہو کر جو انقلاب ان کی زندگی میں رونما ہوا ہے اس کی سب سے زیادہ نمایاں علامت یہ ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان اپنی خدا پرستی کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ کیا یہ خصوصیات اور یہ نتائج کسی ایسی کتاب کے ہو سکتے ہیں جسے کسی جھوٹے انسان نے گھڑ لیا ہو جو اپنی تصنیف کو خدا کی طرف منسوب کر دینے کی انتہائی مجرمانہ جسارت تک کر گزرے؟

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی کسی بات کے متعلق کہے کہ یہ خدا نے فرمائی ہے، درآں حالیکہ فی الواقع وہ خدا نے نہ فرمائی ہو۔

[2] یعنی زمین کی تہوں میں بیج کو پھاڑ کر اس سے درخت کی کونپل نکالنے والا۔

[3] زندہ کو مردہ سے نکالنے کا مطلب بے جان مادّہ سے زندہ مخلوقات کو پیدا کرنا ہے، اور مردہ کو زندہ سے خارج کرنے کا مطلب جاندار اجسام میں سے بے جان مادّے کو خارج کرنا۔

وغروب کا حساب مقرر کیا ہے، یہ سب اسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھیرائے ہوئے اندازے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں[1]۔ اور وہی ہے جس نے ایک متنفس سے تم کو پیدا کیا[2] پھر ہر ایک کے لیے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ۔ یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں اُن لوگوں کے لیے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں[3]۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ سے ہر قسم کی نباتات اُگائی، پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کیے، پھر ان سے تہ بر تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کیے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں، اور انگور، زیتون اور انار کے باغ لگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر اُن کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ اس پر بھی لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھیرا دیا[4] حالانکہ وہ اُن کا خالق ہے، اور بے جانے بوجھے اس کے

---

[1] یعنی اس حقیقت کی نشانیاں کہ خدا صرف ایک ہی ہے کوئی دوسرا نہ خدائی کی صفات رکھتا ہے، نہ خدائی کے اختیارات میں حصہ دار ہے، اور نہ خدائی کے حقوق میں سے کسی حق کا مستحق ہے۔ مگر ان نشانیوں اور علامتوں سے حقیقت تک پہنچنا جاہلوں کے بس کی بات نہیں، اس دولت سے بہرہ ور صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو علمی طریق پر آثارِ کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

[2] یعنی نسلِ انسانی کی ابتداء ایک متنفس سے کی۔

[3] یعنی نوعِ انسانی کی تخلیق، اور تناسل کے ذریعہ سے اس کی افزائش، اور رحمِ مادر میں انسانی بچہ کا نطفہ قرار پا جانے کے بعد سے زمین میں اس کے سونپے جانے تک اس کی زندگی کے مختلف اطوار پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس میں بے شمار کھلی کھلی نشانیاں آدمی کے سامنے آئیں گی جن سے وہ اُس حقیقت کو پہچان سکتا ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ مگر ان نشانیوں سے یہ معرفت حاصل کرنا انھی لوگوں کا کام ہے جو سمجھ بوجھ سے کام لیں۔ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے والے، جو صرف اپنی خواہشات سے اور انھیں پورا کرنے کی تدبیروں ہی سے غرض رکھتے ہیں، ان نشانیوں میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

لیے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں[سلہ] حالانکہ وہ پاک اور بالاتر ہے اُن باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں[ٹلہ] وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کوئی اس کی کوئی شریک زندگی ہی نہیں ہے۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمھارا رب، کوئی الٰہ اس کے سوا نہیں، ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔ نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے، وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے۔

دیکھو، تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں، اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اُٹھائے گا، میں تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں[ٹلہ]۔

اس طرح ہم اپنی آیات کو بار بار مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں تم کسی سے پڑھ آئے ہو، اور جو لوگ علم رکھتے ہیں ان پر ہم حقیقت کو روشن کر دیں[ٹلہ]۔ اے محمد! تمھارے

(بقیہ سابق) [سلہ] یعنی اپنے وہم و گمان سے یہ ٹھیرا لیا کہ کائنات کے انتظام میں اور انسان کی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں اللہ کے ساتھ دوسری پوشیدہ ہستیاں بھی شریک ہیں، کوئی بارش کا دیوتا ہے تو کوئی روئیدگی کا، کوئی دولت کی دیوی ہے تو کوئی بیماری کی۔ وغیر ذالک من الخرافات۔ اس قسم کے لغو اعتقادات دنیا کی تمام مشرک قوموں میں ارواح اور شیاطین اور راکشسوں اور دیوتاؤں اور دیویوں کے متعلق پائے جاتے رہے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [سلہ] جہلائے عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اسی طرح دنیا کی دوسری قوموں نے بھی خدا سے سلسلہ نسب چلایا ہے اور پھر دیوتاؤں اور دیویوں کی ایک پوری نسل اپنے وہم سے پیدا کر دی ہے۔

[ٹلہ] یہ فقرہ اگرچہ اللہ ہی کا کلام ہے مگر نبی کی طرف سے ادا ہو رہا ہے۔ قرآن مجید میں جس طرح مخاطب بار بار بدلتے ہیں کہ کبھی نبی سے خطاب ہوتا ہے، کبھی اہل ایمان سے، کبھی اہل کتاب سے، کبھی کفار و مشرکین سے، کبھی قریش کے لوگوں سے، کبھی اہل عرب سے اور کبھی عام انسانوں سے، حالانکہ اصل غرض پوری نوع انسانی کی ہدایت ہے، اسی طرح متکلم بھی بار بار بدلتے ہیں کہ کہیں متکلم خدا خود ہوتا ہے، کہیں وحی لانے والا فرشتہ، کہیں فرشتوں کا گروہ، کہیں نبی، اور کہیں اہل ایمان، حالانکہ ان سب صورتوں میں کلام وہی ایک خدا کا کلام ہوتا ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

رب کی طرف سے جو وحی نازل کی گئی ہے اس کی پیروی کرو کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور مشرکوں سے منہ موڑ لو۔ اگر اللہ کی مشیئت ہوتی تو (وہ خود ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ) یہ شرک نہ کرتے۔ تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو۔[۱] اور (اے ایمان لانے والو!) یہ لوگ اللہ

(بقیہ سابق) "میں تم پر پاسبان نہیں ہوں"! اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا کام اس روشنی کو تمھارے سامنے پیش کر دینا ہے، اس کے بعد آنکھیں کھول کر دیکھنا یا نہ دیکھنا تمھارا اپنا کام ہے۔ میرے سپرد یہ خدمت نہیں کی گئی ہے کہ جنھوں نے خود آنکھیں بند کر رکھی ہیں ان کی آنکھیں زبردستی کھولوں اور جو کچھ وہ نہیں دیکھتے وہ انھیں دکھا کر ہی چھوڑوں۔

[۲] یہ وہی بات ہے جو سورۂ بقرہ رکوع ۳ میں فرمائی گئی ہے کہ مچھر اور مکڑی وغیرہ چیزوں کی تمثیلیں سن کر حق کے طالب تو اس صداقت کو پا لیتے ہیں جو ان تمثیلوں کے پیرایہ میں بیان ہوتی ہے مگر جن پر انکار کا تعصب مسلط ہے وہ طنز سے کہتے ہیں کہ بھلا اللہ کے کلام میں ان حقیر چیزوں کے ذکر کا کیا کام ہو سکتا ہے۔ اسی مضمون کو یہاں ایک دوسرے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اور کہنے کا مدعا یہ ہے کہ یہ کلام لوگوں کے لیے آزمائش بن گیا ہے جس سے کھوٹے اور کھرے انسان ممیز ہو جاتے ہیں۔ ایک طرح کے انسان وہ ہیں جو اس کلام کو سن کر یا پڑھ کر اس کے مقصد و مدعا پر غور کرتے ہیں اور جو حکمت و نصیحت کی باتیں اس میں فرمائی گئی ہیں ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بخلاف اس کے ایک دوسری طرح کے انسانوں کا حال یہ ہے کہ اسے سننے اور پڑھنے کے بعد ان کا ذہن مغز کلام کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اس ٹٹول میں لگ جاتا ہے کہ آخر یہ اُمّی انسان یہ مضامین لایا کہاں سے ہے، اور چونکہ مخالفانہ تعصب پہلے سے ان کے دل پر قبضہ کیے ہوئے ہوتا ہے اس لیے ایک خدا کی طرف سے نازل شدہ ہونے کے امکان کو چھوڑ کر باقی تمام ممکن التصور صورتیں وہ اپنے ذہن سے تجویز کرتے ہیں اور انھیں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا انھوں نے اس کتاب کے ماخذ کی تحقیق کر لی ہے۔

(حواشی صفحۂ ہذا) [۱] مطلب یہ ہے کہ تمھیں داعی اور مبلغ بنایا گیا ہے، کوتوال نہیں بنایا گیا۔ تمھارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کر دو اور اظہار حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے، تم کو اس کام پر مامور نہیں کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو، اور نہ تمھاری ذمہ داری و جوابدہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمھارے حلقۂ نبوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے۔ لہٰذا اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ اندھوں کو کس طرح بینا بنایا جائے اور جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھنا چاہتے انھیں کیسے دکھایا جائے۔ اگر فی الواقع حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست رہنے ہی نہ دیا جائے (باقی اگلے صفحہ پر)

کے سوا جن کو یہ پکارتے ہیں انھیں تم گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔[۱] ہم نے تو اسی طرح ہر گروہ کے لیے اس کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے[۲]، پھر انھیں اپنے رب ہی کی طرف پلٹ کر آنا ہے، اُس وقت وہ انھیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔

یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی[۳] ہمارے سامنے آجائے تو ہم اس پر ایمان

(بقیہ سابق)، تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی تکوینی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہ بنا سکتا تھا؟ مگر وہاں تو مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں۔ مقصود تو یہ ہے کہ انسان کے لیے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے۔ پس تمہارے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمہیں دکھا دی گئی ہے اس کے اجالے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو اور دوسروں کو اس کی طرف دعوت دیتے رہو۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں انھیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو خواہ وہ دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں، اور جو اسے قبول نہ کریں ان کے پیچھے نہ پڑو۔ جس انجامِ بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اور جانے پر مصر ہیں اس کی طرف جانے کے لیے انھیں چھوڑ دو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یہ نصیحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو کی گئی ہے کہ اپنی تبلیغ کے جوش میں وہ بھی اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرے اور بحث و تکرار کی راہ پر بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبودوں کو گالیاں دینے تک کی نوبت پہنچ جائے، کیونکہ یہ چیز ان کو حق سے قریب لانے کے بجائے اور زیادہ دور پھینک دے گی۔

[۲] یہاں پھر اُس حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہیے جس کی طرف اس سے پہلے بھی ہم اپنے حواشی میں اشارہ کر چکے ہیں کہ جو امور قوانینِ فطرت کے تحت رونما ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں اپنا فعل قرار دیتا ہے کیونکہ وہی ان قوانین کا مقرر کرنے والا ہے اور جو کچھ ان قوانین کے تحت رونما ہوتا ہے وہ اسی کے امر سے رونما ہوتا ہے۔ جس بات کو اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے کہ ہم نے ایسا کیا ہے، اسی کو اگر ہم انسان بیان کریں تو اس طرح کہیں گے کہ فطرۃً ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

[۳] نشانی سے مراد کوئی ایسا صریح محسوس معجزہ ہے جسے دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور آپ کے مامور من اللہ ہونے کو مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

لے آئیں گے۔ اے محمد! ان سے کہو کہ "نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں"[75]۔ اور تمھیں کیسے سمجھایا جائے[76] کہ اگر نشانیاں آبھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔ ہم اسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ پہلی مرتبہ اس پر ایمان نہیں لائے تھے[77]، ہم انھیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑے دیتے ہیں[78]۔ اگر ہم فرشتے بھی ان پر نازل کر دیتے اور مردے ان سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی چیزوں کو ہم ان کی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے الا یہ کہ مشیت الٰہی یہی ہو کہ وہ ایمان لائیں[79]، مگر اکثر لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہیں۔ اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آیند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے رہے ہیں[80]۔ اگر تمھارے

[75] یعنی نشانیوں کے پیش کرنے اور بنا لانے کی قدرت مجھے حاصل نہیں ہے۔ ان کا اختیار تو اللہ کو ہے۔ چاہے تو دکھائے اور نہ چاہے تو نہ دکھائے۔

[76] خطاب مسلمانوں سے ہے جو بے تاب ہو ہو کر تمنا کرتے تھے اور کبھی کبھی زبان سے بھی اس خواہش کا اظہار کر دیتے تھے کہ کوئی ایسی نشانی ظاہر ہو جائے جس سے ان کے گمراہ بھائی راہ راست پر آجائیں۔ ان کی اسی تمنا اور خواہش کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے کہ آخر تمھیں کس طرح سمجھایا جائے کہ ان لوگوں کا ایمان لانا کسی نشانی کے ظہور پر موقوف نہیں ہے۔

[77] یعنی ان کے اندر وہی ذہنیت کام کیے جا رہی ہے جس کی وجہ سے انھوں نے پہلی مرتبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سن کر اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے نقطہ نظر میں ابھی تک کوئی تغیر واقع نہیں ہوا ہے۔ وہی عقل کا پھیر اور نظر کا بھینگا پن جو انھیں اس وقت صحیح سمجھنے اور صحیح دیکھنے سے روک رہا تھا آج بھی ان پر اسی طرح مسلط ہے۔

[78] یعنی جو اپنے اختیار و انتخاب سے تو حق کو باطل کے مقابلہ میں ترجیح دے کر قبول کرنے والے نہیں ہیں، البتہ ان کے حق پرست بننے کی صرف ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ عمل تخلیق و تکوین سے جس طرح تمام بے اختیار مخلوقات کو حق پرست پیدا کیا گیا ہے اسی طرح انھیں بھی بے اختیار کر کے جبلی و پیدائشی حق پرست بنا ڈالا جائے۔ مگر یہ اس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ لہٰذا تمھارا یہ توقع کرنا فضول ہے کہ اللہ تعالیٰ براہ راست اپنی تکوینی مداخلت سے ان کو مومن بنائے گا۔

[80] یعنی آج اگر شیاطین جن و انس متفق ہو کر تمھارے مقابلہ میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں تو گھبرانے کی کوئی بات

(باقی اگلے صفحہ پر)

ربّ کی مشیت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے۔[۱۱۰] پس تم انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افترا

(بقیہ سابق) ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو تمھارے ہی ساتھ پیش آ رہی ہو۔ ہر زمانہ میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ جب کوئی پیغمبر دنیا کو راہ راست دکھانے کے لیے اٹھا تو تمام شیطانی قوتیں اس کے مشن کو ناکام کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئیں۔

"خوش آیند باتوں" سے مراد وہ تمام چالیں اور تدبیریں اور شکوک و شبہات و اعتراضات ہیں جن سے یہ لوگ عوام کو داعی حق اور اس کی دعوت کے خلاف بھڑکانے اور اکسانے کا کام لیتے ہیں، اور ان سب کو بحیثیت مجموعی دھوکے اور فریب سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ حق سے لڑنے کے لیے جو ہتھیار بھی مخالفین حق استعمال کرتے ہیں وہ نہ صرف دوسروں کے لیے بلکہ خود ان کے لیے بھی حقیقت کے اعتبار سے محض ایک دھوکا ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ ان کو نہایت مفید اور کامیاب ہتھیار نظر آتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱۱۰] یہاں ہماری سابق تشریحات کے علاوہ یہ حقیقت بھی اچھی طرح ذہن نشین ہو جانی چاہیے کہ قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی رضا میں بہت بڑا فرق ہے جس کو نظر انداز کر دینے سے بالعموم شدید غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں۔ کسی چیز کا اللہ کی مشیت اور اس کے اذن کے تحت رونما ہونا لازمی طور پر یہ معنی نہیں رکھتا کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی واقعہ کبھی صدور میں نہیں آتا جب تک اللہ اس کے صدور کا اذن نہ دے اور اپنی عظیم الشان اسکیم میں اس کے صدور کی گنجائش نہ نکالے اور اسباب کو اس حد تک مساعد نہ کر دے کہ وہ واقعہ صادر ہو سکے۔ کسی چور کی چوری، کسی قاتل کا قتل، کسی ظالم و مفسد کا ظلم و فساد اور کسی کافر و مشرک کا کفر و شرک اللہ کی مشیت کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور اسی طرح کسی مومن اور کسی متقی انسان کا ایمان و تقویٰ بھی مشیت الٰہی کے بغیر محال ہے۔ دونوں قسم کے واقعات یکساں طور پر مشیت کے تحت رونما ہوتے ہیں، مگر پہلی قسم کے واقعات سے اللہ راضی نہیں ہے اور اس کے برعکس دوسری قسم کے واقعات کو اس کی رضا اور اس کی پسندیدگی و محبوبیت کی سند حاصل ہے۔ اگرچہ آخر کار کسی خیر عظیم ہی کے لیے فرمانروائے کائنات کی مشیت کام کر رہی ہے، لیکن اس خیر عظیم کے ظہور کا راستہ نور و ظلمت، خیر و شر اور صلاح و فساد کی مختلف قوتوں کے ایک دوسرے کے مقابلہ میں نبرد آزما ہونے ہی سے صاف ہوتا ہے۔ اس لیے اپنی بزرگ تر مصلحتوں کی بنا پر وہ طاعت و معصیت، ابراہیمیت اور نمرودیت، موسویت اور فرعونیت، آدمیت اور شیطنت، دونوں کو اپنا اپنا کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اس نے اپنی ذی اختیار مخلوق (جن اور انسان) کو خیر اور شر میں سے کسی ایک کے انتخاب کر لینے کی آزادی عطا کر دی ہے۔ جو چاہے اس کارگاہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

پردازیاں کرتے رہیں۔ (یہ سب کچھ ہم انھیں اسی لیے کرنے دے رہے ہیں کہ) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کے دل اس (خوشنما دھوکے) کی طرف مائل ہوں اور وہ اس سے راضی ہو جائیں اور اُنہی بُرائیوں کا اکتساب کریں جن کا اکتساب وہ کر رہے ہیں ــــ پھر جب حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے؟[۸۱] ــــ اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب ہی

(بقیہ سابق) عالم میں اپنے لیے خیر کا کام پسند کرے اور جو چاہے شر کا کام۔ دونوں قسم کے کارکنوں کو، جس حد تک خدائی مصلحتیں اجازت دیتی ہیں، اسباب کی تائید نصیب ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کی رضا اور اس کی پسندیدگی صرف خیر ہی کے لیے کام کرنے والوں کو حاصل ہے اور اللہ کو محبوب یہی بات ہے کہ اس کے بندے اپنی آزادیٔ انتخاب سے فائدہ اٹھا کر خیر کو اختیار کریں نہ کہ شر کو۔

اس کے ساتھ یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ یہ جو اللہ تعالیٰ دشمنانِ حق کی مخالفانہ کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی مشیّت کا بار بار حوالہ دیتا ہے اس سے مقصود دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے ذریعہ سے اہلِ ایمان کو یہ سمجھانا ہے کہ تمہارے کام کی نوعیت فرشتوں کے کام کی سی نہیں ہے جو کسی مزاحمت کے بغیر احکامِ الٰہی کی تعمیل کر رہے ہیں بلکہ تمہارا اصل کام شریروں اور باغیوں کے مقابلہ میں اللہ کے پسند کردہ طریقہ کو غالب کرنے کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ اللہ اپنی مشیّت کے تحت اُن لوگوں کو بھی کام کرنے کا موقع دے رہا ہے جنھوں نے اپنی سعی و جہد کے لیے خود اللہ سے بغاوت کے راستے کو اختیار کیا ہے اور اسی طرح وہ تم کو بھی جنھوں نے طاعت و بندگی کے راستے کو اختیار کیا ہے، کام کرنے کا پورا موقع دیتا ہے۔ اگرچہ اس کی رضا اور ہدایت و رہنمائی اور تائید و نصرت تمہارے ہی ساتھ ہے کیونکہ تم اُس پہلو میں کام کر رہے ہو جسے وہ پسند کرتا ہے، لیکن تمھیں یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی فوق الفطری مداخلت سے اُن لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دے گا جو ایمان نہیں لانا چاہتے، یا اُن شیاطین جن و انس کو زبردستی تمہارے راستہ سے ہٹا دے گا جنھوں نے اپنے دل و دماغ اور دست و پا کی قوتوں کو اور اپنے وسائل و ذرائع کو حق کی راہ روکنے کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نہیں، اگر تم نے واقعی حق اور نیکی اور صداقت کے لیے کام کرنے کا عزم کیا ہے تو تمھیں باطل پرستوں کے مقابلہ میں سخت کشمکش اور جدوجہد کر کے اپنی حق پرستی کا ثبوت

(باقی اگلے صفحہ پر)

کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو[۱]۔ تمھارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے، کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

اور اے محمد! اگر تم اُن لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمھیں اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیں گے، وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں[۲]۔ درحقیقت تمھارا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے ہٹا ہوا ہے اور کون سیدھی راہ پر ہے۔

پھر اگر تم لوگ اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کا گوشت کھاؤ[۳]۔

(بقیہ سابق) دینا ہوگا۔ ورنہ معجزوں کے زور سے باطل کو مٹانا اور حق کو غالب کرنا ہوتا تو تمھاری ضرورت ہی کیا تھی، اللہ خود ایسا انتظام کر سکتا تھا کہ دنیا میں کوئی شیطان نہ ہوتا اور کسی شرک و کفر کے ظہور کا امکان نہ ہوتا۔

(حاشیہ صفحہ ۴۵۳) [۵] اس فقرہ میں متکلم نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرما رہا ہے کہ ان سب باتوں کے بعد اب تم لوگوں سے کہو کہ جب اللہ نے اپنی کتاب میں صاف صاف تمام حقیقتیں بیان کر دی ہیں اور یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ فوق الفطری مداخلت کے بغیر حق پرستوں کو فطری طریقوں ہی سے غلبۂ حق کی جدوجہد کرنی ہوگی، تو کیا اب میں اللہ کے سوا کوئی اور ایسا صاحبِ امر تلاش کروں جو اللہ کے اس فیصلہ پر نظر ثانی کر کے کچھ دوسرا فیصلہ صادر کرے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو واقعات کی توجیہ میں آج گھڑ لی گئی ہو۔ تمام وہ لوگ جو کتبِ آسمانی کا علم رکھتے ہیں اور جنھیں انبیاء علیہم السلام کے مشن سے واقفیت حاصل ہے، اس بات کی شہادت دیں گے کہ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے ٹھیک ٹھیک امرِ حق ہے اور وہ ازلی و ابدی حقیقت ہے جس میں کبھی فرق نہیں آیا ہے۔

[۲] یعنی بیشتر لوگ جو دنیا میں بستے ہیں علم کے بجائے قیاس و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور ان کے عقائد، تخیلات، فلسفے، اصولِ زندگی، اور قوانینِ عمل سب کے سب قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں۔ بخلاف اس کے اللہ کا راستہ، یعنی دنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ جو اللہ کی رضا کے مطابق ہے، لازماً صرف وہی ایک ہے جس کا علم اللہ نے خود دیا ہے نہ کہ وہ جسے لوگوں نے بطورِ خود اپنے قیاسات سے تجویز کر لیا ہے۔ لہٰذا کسی طالبِ حق کو یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ دنیا کے بیشتر انسان

(باقی اگلے صفحہ پر)

آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالتِ اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے ان کی تفصیل وہ تمھیں بتا چکا ہے۔ بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں، ان حد سے گذرنے والوں کو تمہارا رب خوب جانتا ہے۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی، جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے۔ اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو اس کا گوشت نہ کھاؤ کہ ایسا کرنا فسق ہے۔ شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں، لیکن اگر تم نے ان کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو۔[۱]

کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی[۲] اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ

(بقیہ سابق) کس راستہ پر جا رہے ہیں بلکہ اسے پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس راہ پر چلنا چاہیے جو اللہ نے بتائی ہے۔

[۳] من جملہ ان غلط طریقوں کے جو اکثر اہل زمین نے بطور خود قیاس و گمان سے تجویز کر لیے اور جنھیں مذہبی حدود و قیود کی حیثیت حاصل ہو گئی، ایک وہ پابندیاں بھی ہیں جو کھانے پینے کی چیزوں میں مختلف قوموں کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ بعض چیزوں کو لوگوں نے آپ ہی آپ حلال قرار دے لیا ہے حالانکہ اللہ کی نظر میں وہ حرام ہیں، اور بعض چیزوں کو انھوں نے خود حرام ٹھیرا لیا ہے حالانکہ اللہ نے انھیں حلال کیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ سب سے زیادہ جاہلانہ بات جس پر پہلے بھی بعض گروہ مصر تھے اور آج بھی دنیا کے بعض گروہ مصر ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ کا نام لے کر جو جانور ذبح کیا جائے وہ تو ان کے نزدیک ناجائز ہے اور اللہ کے نام کے بغیر جسے ذبح کیا جائے وہ بالکل جائز ہے۔ اسی کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ یہاں مسلمانوں سے فرما رہا ہے کہ اگر تم حقیقت میں اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس کے احکام کو مانتے ہو تو اُن تمام اوہام اور تعصبات کو چھوڑ دو جو کفار و مشرکین میں پائے جاتے ہیں، اُن سب پابندیوں کو توڑ دو جو خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر لوگوں نے خود عائد کر رکھی ہیں، حرام صرف اسی چیز کو سمجھو جسے خدا نے حرام کیا ہے اور حلال اسی کو ٹھیراؤ جس کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی ایک طرف اللہ کی خداوندی کا اقرار کرنا اور دوسری طرف اللہ سے پھرے ہوئے لوگوں کے امر و نہی اور حدود و حلال و حرام کی پابندی بھی کرنا شرک ہے۔ توحید یہ ہے کہ زندگی سراسر اللہ کی اطاعت میں بسر ہو۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح اُن سے نہ نکلتا ہو؟[۱] کافروں کے لیے تو اسی طرح ان کے اعمال خوشنما بنا دیے گئے ہیں[۲]۔ اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر و فریب کا جال پھیلائیں۔ دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں، مگر انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔

جب ان کے سامنے کوئی نشانی آتی ہے تو وہ کہتے ہیں "ہم نہ مانیں گے جب تک کہ وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے"[۳]۔ اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔ قریب ہے وہ وقت جب یہ مجرم اپنی مکاریوں کی پاداش میں اللہ کے ہاں ذلت اور سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔

(بقیہ سابق) اللہ کے ساتھ اگر دوسروں کو اعتقاداً مستقل بالذات مطاع مان لیا جائے تو یہ اعتقادی شرک ہے، اور اگر عملاً ایسے لوگوں کی اطاعت کی جائے جو اللہ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر خود امر و نہی کے مختار بن گئے ہوں تو یہ عملی شرک ہے۔

[۱] یہاں موت سے مراد جہالت و بے شعوری کی حالت ہے، اور زندگی سے مراد علم و ادراک اور حقیقت شناسی کی حالت۔ جس شخص کو صحیح اور غلط کی تمیز نہیں اور جسے معلوم نہیں کہ راہِ راست کیا ہے وہ طبیعیات کے لحاظ نظر سے چاہے ذی حیات ہو مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کو انسانیت کی زندگی میسر نہیں ہے۔ وہ زندہ حیوان تو ضرور ہے مگر زندہ انسان نہیں۔ زندہ انسان درحقیقت صرف وہ شخص ہے جسے حق اور باطل، نیکی اور بدی، راستی اور ناراستی کا شعور حاصل ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی تم کس طرح یہ توقع کر سکتے ہو کہ جس انسان کو انسانیت کا شعور نصیب ہو چکا ہے اور جو علم کی روشنی میں ٹیڑھے راستوں کے درمیان حق کی سیدھی راہ کو صاف دیکھ رہا ہے وہ ان بے شعور لوگوں کی طرح دنیا میں زندگی بسر کرے گا جو نادانی و جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

[۲] یعنی جن لوگوں کے سامنے روشنی پیش کی جائے اور وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیں جنھیں راہِ راست کی طرف دعوت دی جائے اور وہ اپنے ٹیڑھے راستوں ہی پر چلتے رہنے کو ترجیح دیں اُن کے لیے اللہ کا قانون یہی ہے کہ پھر انھیں تاریکی ہی اچھی معلوم ہونے لگتی ہے، وہ اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر چلنا اور ٹھوکریں کھا کھا کر گرنا ہی پسند کرتے ہیں۔ ان کو جھاڑیاں ہی

(باقی اگلے صفحہ پر)

پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے[1] اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصور کرتے ہی) اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اس طرح اللہ (حق سے فرار اور نفرت کی) ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے، حالانکہ یہ راستہ تمہارے رب کا سیدھا راستہ ہے اور اس کے نشانات ان لوگوں کے لیے واضح کر دیے گئے ہیں جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔ اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس سلامتی کا گھر[2] ہے اور وہ ان کا سرپرست ہے اُس صحیح طرزِ عمل کی وجہ سے جو انھوں نے اختیار کیا۔

جس روز اللہ ان سب لوگوں کو گھیر کر جمع کرے گا، اس روز وہ جنوں[3] سے خطاب کر کے فرمائے گا کہ "اے گروہ جن! تم نے تو نوعِ انسانی پر خوب ہاتھ صاف کیا"۔ انسانوں میں سے جو اُن کے رفیق تھے وہ عرض کریں گے "پروردگار! ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے کو خوب استعمال کیا ہے[4] اور اب ہم اس وقت

(بقیہ سابق) باغ اور کانٹے ہی پھول نظر آتے ہیں، انھیں ہر بدکاری میں مزا آتا ہے، ہر حماقت کو وہ تحقیق سمجھتے ہیں، اور ہر فسادِ انگیز تجربہ کے بعد اس سے بڑھ کر دوسرے فساد انگیز تجربے کے لیے وہ اس امید پر تیار ہو جاتے ہیں کہ پہلے اتفاق سے دہکتے ہوئے انگارے پر ہاتھ پڑ گیا تھا تو اب کے لعل بدخشاں ہاتھ آجائے گا۔

[note] یعنی ہم رسولوں کے اس بیان پر ایمان نہیں لائیں گے کہ ان کے پاس فرشتہ آیا اور خدا کا پیغام لایا، بلکہ ہم صرف اسی وقت ایمان لا سکتے ہیں جب کہ فرشتہ خود ہمارے پاس آئے اور براہِ راست ہم سے کہے کہ یہ اللہ کا پیغام ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] سینہ کھول دینے سے مراد اسلام کی صداقت پر پوری طرح مطمئن کر دینا اور شکوک و شبہات اور تذبذب و تردد کو دور کر دینا ہے۔

[2] "سلامتی کا گھر" یعنی جنت جہاں انسان ہر آفت سے محفوظ اور ہر خرابی سے مامون ہوگا۔

[3] یہاں جنوں سے مراد شیاطین جن ہیں۔

[4] یعنی ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے سے ناجائز فائدے اٹھائے ہیں، ہر ایک دوسرے کو (باقی اگلے صفحہ پر)

پر آپہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لیے مقرر کر دیا تھا"۔ اللہ فرمائے گا" اچھا اب آگ تمہارا ٹھکانا ہے، اس میں تم ہمیشہ رہو گے"۔ اس سے بچیں گے صرف وہی جنھیں اللہ بچانا چاہے گا، بے شک تمہارا رب دانا اور علیم ہے۔ دیکھو، اس طرح ہم (آخرت میں) ظالموں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنائیں گے اُس کمائی کی وجہ سے جو وہ (دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر) کرتے تھے[سلہ]۔ (اس موقع پر اللہ ان سے یہ بھی پوچھے گا کہ) "اے گروہِ جن وانس! کیا تمہارے پاس خود تم ہی میں سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو میری آیات سناتے اور اس دن کے انجام سے ڈراتے تھے؟" وہ کہیں گے" ہاں! ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں[سلہ]"۔ آج دنیا کی زندگی نے اِن لوگوں کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے، مگر اُس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے[سلہ]۔ (یہ شہادت ان سے اس لیے لی جائے گی کہ یہ ثابت ہو جائے کہ) تمہارا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ تباہ کرنے والا نہ تھا جبکہ ان کے باشندے حقیقت سے ناواقف ہوں[سلہ]۔ ع

(بقیہ سابق) فریب میں مبتلا کر کے اپنی خواہشات پوری کرتا رہا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ یعنی اگرچہ اللہ کو اختیار ہے کہ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے، مگر یہ سزا اور معافی بلاوجہ معقول مجرد خواہش کی بنا پر نہیں ہو گی بلکہ علم اور حکمت پر مبنی ہو گی۔ جسے وہ معاف اسی مجرم کو کرے گا جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ وہ خود اپنے جرم کا ذمہ دار نہیں ہے اور جس کے متعلق اس کی حکمت یہ فیصلہ کرے گی کہ اسے سزا نہ دی جانی چاہیے۔

سلہ یعنی جس طرح وہ دنیا میں گناہ سمیٹنے اور برائیوں کا اکتساب کرنے میں ایک دوسرے کے شریک تھے اسی طرح آخرت کی سزا پانے میں بھی وہ ایک دوسرے کے شریکِ حال ہوں گے۔

سلہ یعنی ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ کی طرف سے رسول پر رسول آتے اور ہمیں حقیقت سے خبردار کرتے رہے، مگر یہ ہمارا اپنا قصور تھا کہ ہم نے ان کی بات نہ مانی۔

سلہ یعنی بے خبر اور ناواقف نہ تھے بلکہ کافر تھے، حق اُن تک پہنچا اور انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہر شخص کا درجہ اس کے عمل کے لحاظ سے ہے اور تمہارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ تمہارا رب بے نیاز ہے اور مہربانی اس کا شیوہ ہے۔[سلہ] اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے جس طرح اس نے تمہیں کچھ اور لوگوں کی نسل سے اٹھایا ہے۔

(بقیہ سابق) شہ یعنی اللہ اپنے بندوں کو اپنے مقابلہ میں یہ حجت پیش کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا کہ آپ نے ہمیں حقیقت سے آگاہ نہ کیا، ہمیں صحیح راستہ بتانے کا کوئی انتظام نہ فرمایا، اور جب ناواقفیت کی بنا پر ہم غلط راہ پر چلے تو ہمیں پکڑ لیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور اپنی کتابیں بھیج کر پہلے ہی جن وانس کو حقیقت سے خبردار کرنے کا پورا انتظام کر دیا ہے۔ اب اگر لوگ غلط راستوں پر چلتے ہیں اور اللہ ان کو سزا دیتا ہے تو اس کا الزام خود ان پر ہے نہ کہ اللہ پر۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) سلہ "تمہارا رب بے نیاز ہے" یعنی اس کی کوئی غرض تم سے اٹکی ہوئی نہیں ہے، اس کا کوئی مفاد تم پر وابستہ نہیں ہے کہ تمہاری نافرمانی سے اس کا کچھ بگڑ جاتا ہو یا تمہاری فرماں برداری سے اس کو کوئی فائدہ پہنچ جاتا ہو۔ تم سب مل کر سخت نافرمان بن جاؤ تو اس کی بادشاہی میں ذرہ برابر کمی نہیں کر سکتے اور سب کے سب مل کر اس کے مطیع فرمان اور عبادت گذار بن جاؤ تو اس کے ملک میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ وہ نہ تمہاری سلامیوں کا محتاج ہے اور نہ تمہاری نذر و نیاز کا۔ اپنے بے شمار خزانے تم پر لٹا رہا ہے بغیر اس کے کہ ان کے بدلہ میں اپنے لیے تم سے کچھ چاہے۔

"مہربانی اس کا شیوہ ہے" یہاں موقع و محل کے لحاظ سے اس فقرے کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارا رب تم کو راہِ راست پر چلنے کی جو تلقین کرتا ہے اور حقیقت نفس الامری کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنے سے جو منع کرتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تمہاری راست روی اس کے لیے نافع اور غلط روی اس کے لیے نقصان دہ ہے، بلکہ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ راست روی میں تمہارا اپنا فائدہ اور غلط روی میں تمہارا اپنا نقصان ہے۔ اس لیے یہ سراسر اس کی مہربانی ہے کہ وہ تمہیں اُس صحیح طرزِ عمل کی تعلیم دیتا ہے جس سے تم بلند مدارج تک ترقی کرنے کے قابل بن سکتے ہو اور اس غلط طرزِ عمل سے روکتا ہے جس کی بدولت تم پست مراتب کی طرف تنزل کرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تمہارا رب سخت گیر نہیں ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

تم سے جس چیز کا وعدہ کیا جا رہا ہے وہ یقیناً آنے والی ہے [1] اور تم خدا کو عاجز کر دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اے محمد! کہدو کہ لوگو! تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو اور میں بھی اپنی جگہ عمل کر رہا ہوں [2]، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ انجام کار کس کے حق میں بہتر ہوتا ہے، بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

(بقیہ سابق) تم کو سزا دینے میں اسے کوئی لطف نہیں آتا ہے، وہ تمہیں پکڑنے اور مارنے پر تلا ہوا نہیں ہے کہ ذرا تم سے قصور سرزد ہوا اور وہ تمہاری خبر لے ڈالے۔ درحقیقت وہ اپنی تمام مخلوقات پر نہایت مہربان ہے، غایت درجہ کے رحم و کرم کے ساتھ خدائی کر رہا ہے، اور یہی اس کا معاملہ تمہارے ساتھ بھی ہے۔ اسی لیے وہ تمہارے قصور پر قصور معاف کرتا چلا جاتا ہے، تم نافرمانیاں کرتے ہو، گناہ کرتے ہو، جرائم کا ارتکاب کرتے ہو، اس کے رزق سے پل کر بھی اس کے احکام سے منہ موڑتے ہو، مگر وہ حلم اور عفو ہی سے کام لیے جاتا ہے اور تمہیں سنبھلنے اور سمجھنے اور اپنی اصلاح کر لینے کے لیے مہلت پر مہلت دیے جاتا ہے۔ ورنہ اگر وہ سخت گیر ہوتا تو اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ تمہیں دنیا سے رخصت کر دیتا اور تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اٹھا کھڑا کرتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی قیامت جس کے بعد تمام اگلے پچھلے انسان از سر نو زندہ کیے جائیں گے اور اپنے رب کے سامنے آخری فیصلے کے لیے پیش ہوں گے۔

[2] یعنی اگر میرے سمجھانے سے تم نہیں سمجھتے اور اپنی غلط روی سے باز نہیں آتے تو جس راہ پر تم چل رہے ہو چلے جاؤ اور مجھے اپنی راہ چلنے کے لیے چھوڑ دو، انجام کار جو کچھ ہوگا وہ تمہارے سامنے بھی آجائے گا اور میرے سامنے بھی۔

اشتراکیت اور اسلام

(۳)

از جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی۔ بی۔ اے

کارل مارکس کا پیش کردہ نظریہ تو اس بارے میں بالکل واضح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معاشی نظام درجہ بدرجہ ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے۔ کوئی معاشی نظام اس وقت تک سابقہ نظام کی جگہ نہیں لے سکتا جب تک کہ وہ حالات و شرائط موجود نہ ہوں جو اس کے وجود کے لیے ضروری ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس دور میں جبکہ انسان نظام غلامی کی منزل سے گزر رہا تھا عربوں کی سوسائٹی میں یکایک اشتراکیت سے ایک ملتے جلتے نظام کے لیے ماحول تیار ہو گیا۔ اشتراکیوں کے سامنے جب اس نوع کے سوالات و شبہات پیش کیے جاتے ہیں تو وہ عجیب و غریب تاویلات سے کام لینے لگتے ہیں۔

تاریخی واقعات کی توجیہ کا یہ طریقہ جس کی رو سے معاشی اسباب و محرکات کو انسانی سوسائٹی کی تشکیل میں عنصر غالب شمار کیا جاتا ہے اشتراکی فلسفہ اور تحریک کا لازمی خاصہ بن گیا ہے۔ لیکن گہری نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ تاریخی واقعات و حوادث مختلف النوع اسباب سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مذہبی، سیاسی اور معاشی محرکات مل جل کر واقعات کی تشکیل کرتے ہیں۔ لیکن ان محرکات کی اضافی قوت کا پتہ چلانا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ انسانی فطرت اتنی پیچیدہ ہے کہ انسان کے اجتماعی ارادوں اور اعمال کے متعلق یہ رائے قائم کرنا مشکل ہے کہ ان میں مذہبی محرکات کا حصہ کتنا ہے، سیاسی آرزوئیں اور تمنائیں کہاں تک شامل ہیں، اور معاشی مفاد کا تخیل کس حد تک دخیل ہے۔ ابھی تک وہ آلہ فطرت پیما ایجاد نہیں ہوا ہے جس سے انسانی اعمال کے ان مختلف محرکات و عوامل کا صحیح تناسب معلوم کیا جا سکے۔ اور جب تک اس قسم کا کوئی آلہ اور کوئی تدبیر

انسانی ذہن ایجاد نہ کرے اشتراکیوں کے سوا اور کوئی ہوشمند جماعت یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ مختلف محرکات میں سے کوئی خاص محرک ہمیشہ دوسروں پر غالب رہتا ہے۔

چونکہ اشتراکیت انسانی فطرت کی اس پیچیدگی کو نظر انداز کر کے صرف معاشی محرکات کو انسان کے اجتماعی افعال کا ذمہ دار قرار دیتی ہے اور غیر معاشی محرکات کو ان کے مقابلہ میں بہت کم وزن دیتی ہے اس لیے نتیجہ کے طور پر سوسائٹی کے امراض کے لیے جو علاج وہ تجویز کرتی ہے وہ بھی صرف معاشی اصلاح تک محدود ہے۔ اشتراکیوں کا کہنا یہ ہے کہ ذاتی ملکیت کا وجود ہی دنیا کی تمام برائیوں کا سبب ہے۔ اور اس کے مٹا دینے سے انسان کی تمام معاشرتی خرابیاں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ اشتراکی تحریک اس نظریہ پر مبنی ہے کہ جب سوسائٹی سے طبقاتی امتیازات فنا ہو جائیں گے اور ہر فرد کو اس کی ضروریات زندگی میسر آنے لگیں گی تو سوسائٹی کے اخلاقی عیوب، سیاسی مفاسد اور معاشرتی خرابیاں بہت جلد دور ہو جائیں گی۔ حالانکہ اگر انسان کے اعمال مختلف النوع محرکات سے وجود پذیر ہوتے ہیں اور انسانی فطرت ایک سے زائد عناصر سے ترکیب پاتی ہے تو پھر انسانی مسائل کے حل اور تمدنی خرابیوں کی اصلاح کو صرف ایک جہت سے شروع کرنا کہاں تک نتیجہ خیز ہو سکتا ہے؟

اگر انسانیت کی کامل اصلاح پیشِ نظر ہے تو یہ اصلاح ہر جہتی ہونی چاہیے۔ تمدن و معاشرت، اخلاق و مذہب، سیاست اور معیشت غرض کہ زندگی کے ہر دائرہ میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ یہ تخیل کہ انسان کی معاشی حالت درست ہو جائے اور ذاتی ملکیت مٹا دی جائے تو وہ یکسر فرشتہ خصلت بن جائے گا، دل کش اور نظر فریب تو ضرور ہے مگر حقیقت سے بہت دور ہے۔ آلڈس ہکسلے (Alduous Huxley) اپنی کتاب "Ends and Means" میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"سیاسی اور معاشی اصلاح دفاعی اخلاقیات کا ایک شعبہ ہے۔ دفاعی اخلاقیات کا مقصد یہ ہے کہ ایسا خارجی ماحول پیدا کیا جائے جس میں انسان کو برائی کرنے کا موقع ہی نہ ہو۔ عیسائی اکثر

یہ دعا کیا کرتے ہیں کہ خدا انھیں برے کاموں کی ترغیب سے محفوظ رکھے۔ سیاسی اور معاشی اصلاح اس دعا کا جواب ہے۔ کیونکہ ایسی اصلاح اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ اگر انسان کا معاشرتی ماحول درست کر دیا جائے تو وہ ترغیبات و تحریکات ہی نہ پیدا ہوں گی جن کی وجہ سے انسان برائی پیدا کرتا ہے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کی اصلاحی کوشش انسان کو ایک برائی سے ہٹا کر دوسری برائیوں میں مبتلا کر سکتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سیاسی اور معاشرتی اصلاح کے نتیجہ کے طور پر انسان کے برے میلانات ایک راہ سے ہٹ کر کسی دوسرے مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں۔ برائی کی ایک راہ بند ہو جاتی ہے مگر دوسری راہیں کھل جاتی ہیں۔ برائی مٹتی نہیں ہے۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ وہ اپنی پہلی شکل میں ظاہر ہونے کے بجائے کسی دوسرے روپ میں نمودار ہوتی ہے۔ مثلاً اس برائی کو لیجیے کہ انسان دوسروں پر غلبہ اور اقتدار کی ہوس رکھتا ہے اور دوسروں کے مقابلہ میں اپنی بڑائی چاہتا ہے۔ اب اگر گذشتہ زمانہ کا مقابلہ اس زمانہ سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلے انسان کی ہوس اقتدار اور غلبہ حاصل کرنے کی خواہش فوجی قوت کے ذریعہ سے پوری ہوتی تھی اور اب وہ مال و دولت کے ذریعہ سے پوری ہوتی ہے۔ کسی زمانہ میں تلوار اور نسلی شرافت اس غلبہ کی علامتیں تھیں، اب روپیہ پیسہ اور مال و دولت نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ روس میں ذاتی ملکیت مٹا دی گئی ہے اور مال و دولت کی بنا پر کسی شخص کے لیے غلبہ و اقتدار حاصل کرنا ناممکن ہے۔ لیکن غلبہ کی خواہش اور اقتدار کی ہوس وہاں بھی اسی طرح موجود ہے۔ صرف وہ شکل بدل گئی ہے جس میں یہ حرص و ہوس نمودار ہوتی تھی۔ روس کے نئے نظام میں سیاسی اور حکومتی اقتدار کا حصول انسان کا مطمح نظر بن گیا ہے۔ وہاں لوگ دولت اور روپیہ حاصل کرنے کے بجائے اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اس منتخب گروہ میں وہ کوئی مقام حاصل کریں جس کے ہاتھ میں ملک کا معاشی اور سیاسی اقتدار ہے۔"

جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے ثابت ہوتا ہے محض خارجی اصلاح سے انسانی فطرت کو نہیں بدلا جاسکتا۔ اگر برائی کی فطرت موجود ہے تو وہ اپنے لیے اظہار کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور تلاش کرے گی۔ اسی لیے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اشتراکیوں کا یہ خیال بالکل لغو اور مہمل ہے کہ معاشی اور سیاسی انقلاب کے ذریعہ وہ ایک ایسی سوسائٹی بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے جس میں طبقہ واریت بالکل ناپید ہوگی۔ کیونکہ طبقاتی امتیازات کا اصلی سبب پھر بھی باقی رہے گا۔ یہ امتیازات انسان کی اس فطری خواہش سے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ اپنی سوسائٹی اور اپنے ہم چشموں میں کوئی نمایاں مقام حاصل کرے۔

ہر زمانہ میں تفوق و امتیاز کا کوئی معیار ضرور ہوا کرتا ہے اور سوسائٹی کے وہ افراد جو اتفاقات، خوش قسمتی، یا ذاتی جدوجہد سے اس معیار تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ایک خاص طبقہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جاگیرداری نظام میں معیار تفوق خاندانی شرافت اور فوجی مہارت تھی۔ اس لیے جو لوگ فوجی خصوصیات کے حامل تھے اور اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے جاگیردار طبقہ کی صورت اختیار کر لی۔ نظام سرمایہ داری میں دولت کو معیار تفوق تسلیم کیا جاتا ہے۔ جو لوگ دولت حاصل کر کے اس معیار تفوق تک پہنچ جاتے ہیں وہ مجموعی طور پر سرمایہ دار طبقہ سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ اب فرض کر لیجیے کہ اشتراکی جماعت اپنے خیال کے مطابق واقعی ایک ایسی سوسائٹی کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو جائے جس میں ہر شخص کو بقدر ضرورت سامان معیشت حاصل ہو اور دولت کی بنا پر کسی شخص کو کوئی امتیاز نہ حاصل ہو تب بھی اس سوسائٹی میں کوئی معیار تفوق ضرور ہوگا۔ تمام انسان ہر طرح سے برابر ہونے سے رہے۔ امتیاز و برتری کا کوئی نہ کوئی اصول تو بہر حال قائم رہے گا۔ ملک کی خدمت، فنی کارکردگی، یا اور کسی اہلیت کی بنا پر انسان تعریف و توصیف اور عزت و امتیاز کا مستحق ضرور قرار پائے گا۔ پھر کیا یہ یقینی نہیں ہے کہ وہ تمام لوگ جو ان صفات کے حامل ہوں اور سوسائٹی کے مروجہ معیار تفوق پر پورے اترتے ہوں رفتہ رفتہ ایک طبقہ بن جائیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک انسان میں امتیاز و فوقیت حاصل کرنے کی خواہش موجود ہے

طبقہ واریت کو بالکل مٹایا نہیں جا سکتا۔

اشتراکی نظام میں طبقہ واریت کا پیدا ہونا اُسی طرح یقینی ہے جس طرح صبح کے وقت آفتاب کا طلوع ہونا۔ اس کے باوجود یہ دعویٰ کہ اب تک جتنے تمدن گزرے ہیں وہ سب طبقہ واریت پر مبنی تھے لیکن اشتراکی تہذیب طبقہ واریت کو بالکل مٹا دے گی، جہالت اور ہٹ دھرمی کے سوا اور کسی چیز پر مبنی نہیں ہے۔ خود روس کا موجودہ اشتراکی نظام طبقہ واریت سے خالی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مٹ جانے سے سوسائٹی میں ظالم و مظلوم کی وہ پہلی سی تفریق نہیں رہی ہے جو آفرینش دولت کے آلات و وسائل کی ذاتی ملکیت پر قائم تھی۔ لیکن اشتراکی روس میں اب نئے معاشرتی طبقات وجود میں آنے شروع ہو گئے ہیں جن سے اس مفروضہ کی تردید ہوتی ہے کہ روسی معاشرہ طبقہ واریت سے بالکل پاک ہے۔

یہ نئے طبقے انتظامی عہدہ داروں، ہنر آموختہ (Skilled) مزدوروں اور اجتماعی بنیاد پر کام کرنے والے خوش حال کسانوں پر مشتمل ہیں۔ ان نئے طبقوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے اور موجودہ اشتراکی نظام پر انہی لوگوں کا قبضہ ہے۔ یہی وہ حکمراں طبقات ہیں جو اس وقت روس کا نظام چلا رہے ہیں۔ ان کی تنخواہیں اور اجرتیں عام مزدوروں اور کام کرنے والوں سے بدرجہا زیادہ ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تقسیم دولت اور معیارِ زندگی کے اعتبار سے روسی آبادی میں رفتہ رفتہ نمایاں امتیازات پیدا ہوتے جاتے ہیں۔

انسان کی علمی اور تمدنی ترقی نے اس کے جذبات و تخیلات اور اس کی بنیادی فطرت کو کتنا کم متاثر کیا ہے اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ انسانی تاریخ میں جب کبھی اشتراکیت نے سر اُٹھایا ہے اس نے ملک کی قدرتی دولت کی طرح عورتوں کو بھی مشترک ملکیت قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ ایران میں قباد کے زمانہ میں مزدکی مذہب بھی اسی اصول کا حامی تھا کہ مرد و زن کے تعلقات کو شادی بیاہ کے قیود

سے آزاد کر دیا جائے اور مال و دولت کی طرح عورتیں بھی جمہور کی مشترکہ ملکیت ہوں۔ اس سے قبل افلاطون نے اپنی خیالی ریاست کے لیے جو نظام تجویز کیا تھا اس میں سپاہیوں اور محافظوں کے لیے نکاح کی قید اٹھا دی تھی اور محافظوں کو یہ حق دیا تھا کہ وہ جس عورت اور مرد کو چاہیں مناسب اوقات میں یکجا کر دیں۔ یہ یاد رہے کہ افلاطون کی مجوزہ ریاست میں سپاہیوں اور محافظوں کو ذاتی ملکیت سے محروم کر دیا گیا تھا اور ان کے لیے جو نظامِ زندگی بنایا گیا تھا وہ خالص اشتراکی نظام تھا۔ موجودہ روسی اشتراکیت بھی خاندانی نظام کی دشمن ہے اور مرد و زن کے تعلقات پر کوئی قانونی یا اخلاقی پابندی عائد کرنا نہیں چاہتی۔ غرضکہ اباحتِ مطلقہ ہمیشہ سے اشتراکیت کی شان رہی ہے۔

اب ہر انصاف پسند شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ ایک ایسے نظام میں جہاں ہر شخص کو وسائلِ معیشت بآسانی میسر آتے ہوں اور جہاں صنفی خواہشات و تعلقات پر کوئی اخلاقی، مذہبی یا سماجی گرفت نہ ہو، وہاں صنفی بدعنوانیوں اور فواحش کی کیسی کثرت ہوگی اور انسانی نسل کو کیسا ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہوگا۔ اشتراکیوں سے جب کبھی اس موضوع پر بحث کی جاتی ہے وہ فوراً موجودہ اشتراکی روس کی مثال دے کر کہتے ہیں کہ روس میں صنفی بدعنوانیوں کی وہ کثرت نہیں ہے جو امریکہ یا انگلستان یا فرانس میں ہے۔ حالانکہ وہاں مرد و زن کے تعلقات پر کوئی قید نہیں ہے۔

ممکن ہے کہ اشتراکیوں کا کہنا صحیح ہو اور روس میں ابھی تک وہ حالت نہ پیدا ہوئی ہو جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن روس کی موجودہ حالت کو بطور مثال پیش کرتے ہوئے اشتراکیوں کو یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ اول تو روس میں ابھی اشتراکی نظام پوری طرح قائم ہی نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ جیسا اس سے قبل بتایا جا چکا ہے خود لینن نے اکثر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ روس کے موجودہ نظام کو اشتراکی نظام نہیں کہا جا سکتا بلکہ ریاستی سرمایہ داری (State Capitalism) کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔
دوئم یہ کہ اخلاقی محاسن کی طرح اخلاقی معائب کے نتائج و اثرات بھی بہت دیر میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ابھی روسی نظام قائم ہوئے صرف بیس یا بائیس سال کا عرصہ گزرا ہے اور اشتراکی تربیت پائے ہوئے نوجوانوں کی پہلی نسل بھی تیار نہیں ہوئی ہے۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ابھی روسی اشتراکیت تخیل اور نصب العین کی زندگی سے مالا مال ہے اور دوسرے سرمایہ دار ممالک سے اس کا مقابلہ ہے۔

اگر اشتراکیوں کے تخیل کے مطابق ساری دنیا پر اشتراکی نظام غالب آجائے یا اشتراکیت دنیا کے بڑے حصہ میں پھیل جائے اور تخیل کی وہ تازگی اور نصب العین کی وہ قوت مرور زمانہ سے پژمردہ ہوجائے جو ابھی تک اس میں باقی ہے تو اس وقت مادی خوش حالی اور لذت پرستی کے سوا اور کوئی نصب العین اس سوسائٹی میں نہ ہوگا اور نہ طاقتور حریفوں کا خوف اسے اپنی اندرونی اخلاقی حفاظت پر آمادہ کریگا۔ اس وقت جو اخلاقی انتشار اشتراکی سوسائٹی میں پیدا ہوگا اس کی وجہ سے اشتراکی نسل قطعاً برباد ہوجائے گی۔

اسلامی نظریات | جو لوگ اشتراکیت اور اسلام کے امتزاج سے ایک نیا مرکب تیار کرنا چاہتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت کے درمیان کوئی بنیادی تضاد نہیں ہے وہ انتہائی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اشتراکیت ماورائے مادہ کسی حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے حالانکہ اسلام سب سے پہلا مطالبہ انسان سے یہ کرتا ہے کہ وہ چند بنیادی حقائق پر ایمان لے آئے جو تجربہ کی رسائی سے ماوراء اور عقل کے حدود سے بالاتر ہیں۔ اسلام کی ساری تعلیم خدا کے تصور اور آخرت کے یقین پر قائم ہے اور کوئی شخص اسلامی سوسائٹی کا رکن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ خدا کی ذات و صفات اور حیاتِ اخروی کے دونوں بنیادی حقائق کو بے چون وچرا تسلیم نہ کرلے۔ اس کے برخلاف کوئی شخص کمیونسٹ پارٹی میں شرکت نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ خدا کے وجود اور آخرت کے تصور کا منکر نہ ہو۔

اس بنیادی فرق کو سمجھ لینے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاشی امور کے متعلق اسلام اور اشتراکیت کے نقطۂ نظر میں کیا فرق ہے۔ غور سے دیکھیے تو معاشیات کے دائرے میں بھی یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اشتراکیت معاشی خوش حالی کے حصول کو مقصود بالذات قرار دیتی ہے۔ اس کا ابتدا و منتہا

اور مقصد و غایت ہی مادی فراغت اور معاشی مساوات ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حصولِ معیشت اور اکتسابِ مال بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ وہ ایک وسیلہ ہے اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کا۔

اسلام نے چونکہ انسان کو زمین پر خدا کا خلیفہ اور اس کا نائب قرار دیا ہے اور اس حیثیت میں اس کے سپرد یہ منصب کیا ہے کہ وہ انفرادی طور پر خدا کی ذات و صفات سے قربت و مشابہت حاصل کرے اور اجتماعی حیثیت سے خدا کے قانون کو انسان کے خود ساختہ نظریات و قوانین پر بالاتر کرے اس لیے وہ معاشی اصلاح کو اس نصب العین کے حصول کا ایک ضروری وسیلہ قرار دیتا ہے اور انسان کے معاشی مسئلہ کو اسی حیثیت پر قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس کو نہ کسی خاص طبقہ سے کوئی دشمنی ہے نہ وہ غریبوں کو دولتمندوں سے رشک و حسد کرنا سکھاتا ہے اور نہ اسے بورژوا یا متوسط طبقہ سے نفرت ہے۔ وہ معاشی اصلاح کے ذریعہ دولت کو محدود ہو جانے سے روکنا ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن اس کا اصل مقصد انسان کے اخلاقی احساس کو اتنا بیدار اور قوی کر دینا ہے کہ ہر فرد اخوت و ہمدردی کے جذبہ سے سرشار ہو جائے اور دوسروں کے مصائب و تکالیف میں ان کی مالی اعانت کرنا اپنا دینی فرض خیال کرے۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی تعمیر کرنا چاہتا ہے جس میں دولت سمٹ سمٹا کر ایک محدود طبقہ کے ہاتھوں میں نہ چلی جائے بلکہ وہ سوسائٹی کے زیادہ سے زیادہ افراد کے درمیان پھیلے اور گردش کرے۔ اس کے متعلق کلام مجید کا ارشاد یہ ہے:-

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ

جو کچھ اللہ اپنے رسول کے ہاتھ لگا دے بستیوں والوں سے وہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور (رسول کے) ناتے والوں کے لیے اور یتیموں اور محتاجوں اور اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ صرف دولتمندوں کے درمیان گردش نہ کرے۔

آیت کے آخری جزو میں اس نے صاف طور پر کہدیا ہے کہ وہ اجتماعی دولت کو صرف دولتمندوں کا حق نہیں سمجھتا بلکہ اس کی تقسیم میں ہر طبقہ کے افراد کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کو مٹانے کی پوری کوشش کی ہے جو دولت حاصل کرنے میں تو بڑی بے باک ہے لیکن اس کے صرف کرنے میں بیحد تنگدل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم دولت کما سکتے ہو لیکن یہ حق نہیں رکھتے کہ اس کے انبار لگاتے رہو یا صرف اپنی راحت و آرام پر اسے صرف کرتے رہو۔ نماز اور زکوٰۃ کے بعد کلام مجید میں شاید ہی کسی اور بات کو اتنی بار دہرایا گیا ہو جتنا اس بات کو کہ دولت خدا کی راہ میں صرف کرتے رہنا چاہیے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو سختی سے متنبہ کیا گیا ہے جو دولت جمع کرتے ہیں لیکن خدا کی راہ میں صرف نہیں کرتے۔ ارشاد ہوا ہے :-

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ	جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں لیکن خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں سخت عذاب کی خوشخبری دیدو۔

ایک اور جگہ یہ بات بتائی گئی ہے کہ انسان نیکی حاصل نہیں کر سکتا جب تک اپنی دولت کو راہ خدا میں صرف نہ کرے :

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ	تم نیکی ہرگز حاصل نہ کر سکو گے جب تک کہ ہر اس چیز کو جس سے تم محبت کرتے ہو (راہ خدا میں) صرف نہ کرو

دولت کو زیادہ سے زیادہ افراد میں تقسیم کرنے کی غرض سے اسلام نے خاندانی نظام کو باقی رکھنا ضروری سمجھا کیونکہ خاندان انسانی زندگی اور تمدن کی ایک قدرتی اکائی ہے اور دنیا کے تمام خارجی نظامات میں سب سے زیادہ مستحکم اور بھروسہ کے قابل ہے۔ حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ سیاسی اور معاشی انقلابات کی آندھیاں آتی اور گزر جاتی ہیں۔ طبقاتی تقسیم بدلتی رہتی ہے۔ لیکن خاندان اپنی جگہ

مضبوطی سے قائم ہے اور رہے گا۔ اشتراکیوں اور دوسرے خیال پرستوں کے ادعا کے باوجود انسانی تمدن پر وہ دور کبھی نہیں آیا اور نہ آسکتا ہے جب انسان خاندانی رشتوں اور بندھنوں سے اپنا پیچھا چھڑا سکے۔ جہاں بھی دس بیس آدمی بسیں گے شادی بیاہ ہوگا، شوہر، بیوی، ماں باپ، بھائی، بہن، داماد، خسر کے رشتے ہوں گے اور انسان الفتوں اور قرابتوں کے ایک پھیلتے ہوئے سلسلہ میں منسلک رہے گا۔

انسانی زندگی کی اس فطری وحدت کو اسلام اپنے اخلاقی اور معاشی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور اس باہمی امداد و معاونت کے جذبے پر جو فطرۃً خاندان کے افراد میں ایک دوسرے کے لیے موجود ہوتا ہے وہ مذہبی احساس کی مہر لگا دیتا ہے تاکہ انسان نفس پرستی اور خود غرضی کی کیسی ہی شدید حالت سے گزر رہا ہو پھر بھی کم از کم ایک محدود دائرہ میں وہ دوسروں کی امداد و پرورش کا ذریعہ بنا رہے اسی غرض سے اسلام نے خاندانی زندگی کو چھوٹے پیمانہ پر امداد باہمی کا ادارہ بنا دیا ہے اور اہل خاندان کے حقوق و فرائض پر مذہبی احکام کا وزن ڈال دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں کئی مقامات پر ذوی القربیٰ کے حقوق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور غیر مستطیع اقربا کی امداد انسان کی پہلی ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔ ایک جگہ نہایت بلیغ انداز میں یہ حکم سنایا گیا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاۤئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۤءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ۔	اللہ تمھیں حکم دیتا ہے انصاف کا، نیکی کا، اور (غیر مستطیع) عزیزوں کی امداد کا اور تمھیں روکتا ہے فحش باتوں اور برے کاموں اور نافرمانی سے۔

اپنے قوانین وراثت میں بھی اسلام نے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ وراثت افراد خاندان کی زیادہ سے زیادہ تعداد پر تقسیم ہو۔ اس بارے میں اگر ان کا مقابلہ مغربی ممالک کے مماثل قوانین سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں میں دولت اس طرح ایک جگہ جمع ہی نہیں ہو سکتی جیسے کہ مغرب میں وہ ایک

خاص حلقہ میں گردش کرتی رہتی ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کا سنگ بنیاد زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ وہ رقم ہے جو صاحب استطاعت افراد سے لے کر غریبوں اور غیر مستطیع افراد میں تقسیم کی جاتی ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ زکوٰۃ اس قسم کی کوئی رقم ہے جو آج کل حکومتیں اپنی رعایا سے وصول کرتی ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے جتنے ٹیکس عوام سے وصول کیے جاتے ہیں وہ ان منافع اور فوائد کے معاوضہ میں لیے جاتے ہیں جو عوام کو حکومت کی سرگرمیوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن زکوٰۃ وہ ٹیکس ہے جو محض غیر مستطیع افراد کی مالی اعانت کے لیے وصول کیا جاتا ہے اور اس کے معاوضہ میں محصول دہندگان (Tax-payers) کو کوئی دوسرا فائدہ کسی اور شکل میں نہیں ہوتا ہے۔ اسی لیے زکوٰۃ کے مصارف بھی معین کر دیے گئے ہیں۔ یعنی زکوٰۃ کی رقم صرف غریبوں کی مالی اعانت میں صرف کی جا سکتی ہے۔ لیکن دوسرے مصرف میں نہیں لگائی جا سکتی۔

یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ غربار اور حاجتمندوں کی تعداد کے مقابلہ میں زکوٰۃ کی رقم اس قدر قلیل ہوگی کہ اس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ حکومت جو معاشرتی خدمات Social Services انجام دیتی ہے، مثلاً سڑکوں اور پلوں کی تیاری، آب پاشی اور نہر سازی کے انتظامات، ریلوں اور ہوائی سروس کا قیام، یا اسی طرح کے دوسرے کام، ان کے لیے زکوٰۃ کی رقم میں سے ایک پیسہ بھی وہ صرف کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ جب اس بات کا لحاظ کیا جائے کہ اسلامی حکومت میں معادن (Mines) پر بھی خمس یعنی پانچواں حصہ وصول کیا جاتا تھا اور اس کا شمار بھی زکوٰۃ میں ہوتا تھا تو پھر یہ اعتراض اور بھی بے معنی ہو جاتا ہے کہ زکوٰۃ کی رقم لاکھوں بلکہ کروڑوں تک پہنچ سکتی ہے۔

ایک اور بے معنی اعتراض اس سلسلہ میں یہ کیا جاتا ہے کہ زکوٰۃ کو غیر مستطیع افراد پر صرف کرنے سے یہ لوگ ناکارہ ہو جائیں گے اور ان میں کام کرنے کا حوصلہ باقی نہیں رہے گا۔ معترضین شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت ہر غریب آدمی کو گھر بیٹھے زکوٰۃ کی رقم میں سے اس کا حصہ دیدیا کرے گی خواہ وہ کوئی کام کرے یا

نہ کرے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ کوئی ہوشمند حکومت افرادِ ملک کو اس طرح بے کار رہنے کی تعلیم نہیں دے گی۔ مستحقین تک زکوٰۃ کی رقم پہنچانے کے ہزاروں طریقے ہو سکتے ہیں جن سے ان کی احتیاج بھی دور ہو جائے اور بے کار بیٹھ کر کھانے کی عادت بھی نہ پڑے۔ مثلاً غریبوں کے لیے حکومت سستے اور آرام دہ مکانات تعمیر کر سکتی ہے، غریب بچوں کے لیے وسطانی اور تحتانی تعلیم مفت کر دی جا سکتی ہے، غریب طلبا کے لئے خریداری کتب کا انتظام کیا جا سکتا ہے، غریب کسانوں کے قرضہ کا بار ہلکا کیا جا سکتا ہے، یا انھیں اشیاء اور آلات خریدنے کے لیے رقم دی جا سکتی ہے، بیواؤں کے لیے وظائف مقرر کیے جا سکتے ہیں، غرضکہ متعدد صورتوں میں زکوٰۃ اس طرح صرف کی جا سکتی ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانے والے بے کار نہ بن جائیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ملک کے تمام قدرتی وسائل اور اس کی قدرتی دولت افراد کی نہیں بلکہ حکومت کی ملک ہے۔ آئندہ اگر اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو وہ تمام بنیادی اور کلیدی صنعتیں جن پر صنعتی نظام کا دار و مدار ہوتا ہے حکومت کی ملک ہوں گی۔ ایسی حکومت میں سرمایہ داروں کا زور بالکل ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ جو صنعتیں انفرادی طور پر اہلِ ملک کے قبضہ میں رہیں گی وہ بنیادی صنعتوں کی پیداوار سے استفادہ کیے بغیر قائم نہ ہو سکیں گی۔ اس دعوے کے لیے سب سے مضبوط سند حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ فیصلہ ہے جو آپ نے شام و عراق کی فتوحات کے بعد وہاں کی اراضی کی ملکیت کے بارے میں فرمایا تھا۔ ان ممالک کی مفتوحہ اراضی کے متعلق اہلِ فوج کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ ان سپاہیوں اور فوجوں کو دیدی جائیں جنھوں نے ممالک مذکور فتح کیے تھے۔ اس مطالبہ کی سند میں اہلِ فوج نے رومی سلطنت کے جاگیری نظام کو پیش کیا جس کے تحت شام کی اراضی اس کے اصلی باشندوں سے چھین کر زمینداروں اور فوجی جاگیرداروں میں تقسیم کر دی گئیں اور زمینوں کے اصلی مالکوں کو مزدوروں کی طرح اجرت پر کام کرنا پڑتا تھا لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہلِ فوج کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا اور ان کے

سے ماہوار تنخواہیں اور وظائف مقرر کرکے مفتوحہ اراضی کو حکومت کی ملکیت قرار دیا اور زمینیں ملک کے اصلی باشندوں کو واپس کر دیں۔ اور اس طرح جاگیرداری نظام کو یکقلم مٹا دیا۔

اسلام کے معاشی نظام کے متعلق اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام نہ تو خالص اشتراکیت ہے اور نہ خالص سرمایہ داری بلکہ ان انتہاؤں کے درمیان وہ ایک اعتدال پیدا کرتا ہے۔ وہ ذاتی ملکیت کو باقی رکھنا ضروری خیال کرتا ہے لیکن اس پر ایسی قیود و شرائط عائد کرتا ہے کہ وہ معاشی استحصال (Exploitation) کا ذریعہ نہ بننے پائے۔

معاشی امور میں اسلام اور اشتراکیت کے درمیان جو کچھ مشابہت نظر آتی ہے وہ صرف سطح سے تعلق رکھتی ہے ورنہ اپنی بنیاد اور روح کے اعتبار سے ان دونوں نظامات میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔

اخلاق و معاشرت اور تمدن کے مسائل میں اشتراکیت اور اسلام کے نقطۂ نظر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اخلاقی اصلاح کی بابت اشتراکیت کا نقطۂ نظر خارجیت پسندی پر مبنی ہے یعنی وہ انسان کی اخلاقی برائیوں کو خارجی ماحول کی خرابیوں پر محمول کرتی ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اگر انسان کا عمرانی ماحول درست کر دیا جائے، اسے معاشی آزادی دے دی جائے، اور سیاسی غلامی کی زنجیروں سے اسے رہا کر دیا جائے تو اس کی تمام برائیاں اور مجرمانہ میلانات خود بخود دور ہو جائیں گے۔ کیونکہ جرم اور بداعمالی کی ترغیب معاشرتی مجبوریوں سے ہوتی ہے۔

اشتراکیت انسانی فطرت کی طرف سے بہت خوش عقیدہ واقع ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف اسلام نے نہ تو سینٹ پال کی عیسائیت کی طرح انسان کو پیدائشی گنہگار قرار دیتے ہوئے اس کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اس کی سرشت سے برائی دور ہی نہیں ہو سکتی اور نہ وہ اشتراکیت کی طرح انسان کے متعلق یہ حسن ظن رکھتا ہے کہ خارجی اور عمرانی ماحول کے درست ہوتے ہی انسان فرشتہ بن جائے گا۔ اس بارے میں بھی وہ اپنے اس اعتدال اور توازن کو نہیں چھوڑتا جو اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے

کہ ایک حد تک انسان کا معاشرتی ماحول اسے برائی کی ترغیب دیتا ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ جہاں عمرانی اور معاشرتی ماحول کی اصلاح سے انسان کی بہت سی برائیاں دور ہو سکتی ہیں وہاں بعض برائیاں ایسی بھی ہیں جن کا عمرانی اور معاشرتی ماحول سے کوئی لازمی تعلق نہیں ہے۔ اور جو ضبطِ نفس کی کمی، اخلاقی تربیت کے فقدان اور ماورائے مادہ حقائق پر ایمان نہ لانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے اگر خارجی ماحول کو درست کر دیجیے اور یقیناً اسے درست کرنا چاہیے تو بعض برائیاں دور ہو جائیں گی لیکن بہت سی برائیاں پھر بھی باقی رہیں گی۔ اور یہ برائیاں اس وقت تک نہیں مٹ سکتیں جب تک انسان میں وہ اخلاقی احساس نہ پیدا ہو جائے جو حکومت کے جبر و تخویف، سوسائٹی کی مدح و ذم اور دنیوی نتائج کے خوف سے بے نیاز ہو کر بھی اسے نیکی اور سچائی پر قائم رکھے۔

جو انسان برائی سے اس لیے بچا رہے کہ اس کا ماحول ایسی ترغیبات سے خالی ہے جو اسے برائی کی طرف مائل کریں وہ یقیناً بہت کمزور بنیاد پر کھڑا ہے۔ کیونکہ ماحول کی ذرا سی خرابی اسے پھر برا بنا سکتی ہے۔ سیرت کی مضبوطی اور کردار کی بلندی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان برائی کے درمیان رہ کر بھی اپنی اخلاقی قوت کے باعث اس سے محفوظ رہے۔ یہ سیرت اور یہ کردار اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب انسان اپنی مادی زندگی کے علاوہ ایک حیاتِ برتر کا یقین رکھتا ہو جس میں بدی کا نتیجہ نقصان و تکلیف کی شکل میں اس قطعیت و یقین کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے جیسے اس عالم میں طبعی اسباب کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی لیے اسلام نے خدا کے تصور اور آخرت کے یقین کو اپنے اخلاقی نظام کا سنگِ بنیاد قرار دیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے خارجی زندگی کی اصلاح کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

درحقیقت وہ زندگی اور تمدن کے مسائل پر ہر طرف سے حملہ آور ہوتا ہے تاکہ ان کے لیے کوئی راہِ فرار باقی نہ رہے۔ وہ تسخیرِ کامل کا عزم لے کر اٹھا ہے۔ بخلاف اس کے دوسرے نظامات صرف جزوی تسخیر پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور اپنا حملہ صرف ایک نقطہ پر مرکوز کر کے سارا کھیل بگاڑ دیتے ہیں، کیونکہ اس

غلط چال کی وجہ سے خود حملہ آور بعض وقت محصور ہو جاتا ہے۔

آخر میں میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ اشتراکیت کوئی عالمگیر تحریک نہیں ہے بلکہ وہ مغربی دنیا کے حالات اور مغرب کے نفسیاتی اور اخلاقی مزاج کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ اس کے اصول اسی نفسیاتی اور اخلاقی ماحول کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں۔ مشرق اور خصوصاً اسلامی ممالک اپنا ایک الگ ماحول رکھتے ہیں اور ان کی تاریخ جن اخلاقی اور نفسیاتی موثرات سے بنی ہے وہ ان عوامل سے مختلف ہیں جنھوں نے مغرب کی تاریخ بنائی ہے۔ درحقیقت اشتراکی تحریک مغرب کے زوال آمادہ اور سڑے ہوئے تمدن کا آخری پانسہ وار ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ وار بھی خالی جائے گا۔ ہماری لڑائی اس سے اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ اپنے اندر کوئی صداقت نہیں رکھتی۔ وہ ایک بہت بڑی صداقت کی حامل ہے۔ لیکن اس صداقت پر باطل اوہامات وتخیلات کے تہ در تہ پردے ڈال کر اصلیت کا چہرہ مسخ کر دیا ہے۔ اسلامی نظام سے اس کا مقابلہ کرنا بے کار ہے کیونکہ یہ نظام ایک محکم حقیقت ہے۔ اور مخالفوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو دنیا کو مجبوراً گھوم پھر کر پھر اسی طرف آنا ہے۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

(کفار) چاہتے ہیں کہ اپنی پھونک سے خدا کا نور بجھا دیں لیکن اللہ اپنا نور پورا کر کے رہے گا خواہ مشرکوں پر یہ بات کتنی ہی گراں گزرے۔

تاریخ کے جدلی عمل میں تکرار

تمدّنی ارتقاء کا پس منظر

"یہ کتاب "حقائق" سے اخذ کیے ہوئے ایک جدید تر فلسفہ تاریخ کا ابتدائی خاکہ ہے جو وضاحت کے لیے ایک مستقل تصنیف کا محتاج ہے لیکن اس مستقل تصنیف کے لیے جن حالات کا میں منتظر ہوں معلوم نہیں وہ کب میسر ہوں اور ادھر حال یہ ہے کہ ہماری نوعی تاریخ ایک دوراہے کے قریب آپہنچی ہے اور اس کی رفتار معمول سے کچھ زیادہ تیز ہے۔ اب سوال یہ درپیش ہے کہ تاریخ کی گاڑی کو کس راستہ پر ڈالا جائے۔ اس سوال کے جواب میں مختلف اصولوں کے علمبردار "انجن" پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں لیکن کچھ نیند کے ماتے اس حالت میں بھی واقعاتی دنیا کر الگ تھلگ خوابوں کی بستیاں بسائے ہوئے ہیں۔ راقم الحروف کا مقصد انہی خفتہ بختوں کو جھنجوڑنا ہے اور اسی وقتی ضرورت کے لیے ایک وسیع علمی بحث کو چند صفحات میں سمیٹ کر پیش کیا جا رہا ہے۔ (نعیم صدیقی)

انسان کے لیے یہ سوال بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ تاریخ کی تشکیل کس طریقہ سے ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں ایک فرد کس طرح حصہ لے سکتا ہے کہ وہ انسانیت کے مقتضیات کو بوجوہ احسن پورا کر سکے۔ چنانچہ اہل فکر نے اس سوال کے جواب میں اپنے اپنے نتائج فکر پیش کیے ہیں۔ مثلاً ابن خلدون کے مقدمہ میں تاریخ کی حقیقت پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ بریں سرہنری بکل، موسیو لیبان اور براؤن وغیرہ نے بھی بعض حقائق کی نقاب کشائی کی ہے لیکن تاریخ کے فلسفہ کی اصل تدوین ہیگل سے شروع ہوتی ہے اور مارکس اس میں تکمیلی رنگ بھرتا ہے

جہاں تک تجربات سے نتائج اخذ کرنے کا تعلق ہے وہاں تک تو اس کا امکان ہے کہ انسان حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے لیکن جہاں سے قیاس کی سرحد شروع ہوتی ہے وہاں بچارا ذوقِ تحقیق یقین اور وثوق کے پردوں سے محروم

ہو کر اندھیرے میں رینگنا شروع کرتا ہے۔ قدم قدم پر خوف، تعجب اور شبہات سے اسے سابقہ پیش آتا ہے۔ آخر ایک مقام ایسا آتا ہے کہ آگے بڑھنا ناممکن ہوتا ہے۔ یہاں سے "ذوقِ تحقیق" واپس لوٹتا ہے اور غلط سلط نتائج کو جمع کر کے نوعِ انسانی کے آگے لا رکھتا ہے۔ انھیں نتائج کا مرعوب کن نام ہمارے ہاں فلسفہ ہے۔

حقیقت کی نقاب کشائی میں جو حال دوسرے فلاسفہ کا ہے وہی ہیگل اور مارکس کا ہے۔ دونوں نے جہاں تک تجرباتی علم کا تعلق تھا، جہالت کے پردوں کے پیچھے سے حقیقت کے چہرے کی دھندلی سی جھلک ضرور دیکھی لیکن اس کے خد و خال کے تعین میں جہاں قیاس سے کام لیا وہاں دونوں بھٹک گئے اور اپنے پیچھے ایسے غلط نظریات چھوڑ گئے جنھوں نے نوعِ انسانی کا رُخ ایک غلط منزل کی طرف پھیر دیا۔

ہیگل نے اس حقیقت کو تو سمجھ لیا کہ تاریخ اضداد کے تصادم در تصادم کا مسلسل نتیجہ ہے مگر اس سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے تاریخ کو ہر پہلو سے ارتقا ہی کرتے ہوئے دیکھا حالانکہ تاریخ کا ایک عمل "تکرار" بھی ہے۔ مارکس بھی غلط فہمی کی اس لکیر کو آنکھیں موند کر عبور کر گیا بلکہ اس نے "غلطی مضمون" کی شراب کو دو آتشہ کرتے ہوئے یہ دعویٰ پیش کیا کہ تاریخ کے عمل تصادم کو جاری رکھنے والے محرکات صرف معاشی ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے حقیقت یہ تھی کہ تاریخ کا عمل تصادم مرہونِ منت ہے ان معاشی اور اخلاقی قوتوں کے "اضدادی زوجین" کا جو انسانی ذہنیت میں فطرت نے پیوست کر رکھے ہیں۔ اگر ہمارے ذہنی عوامل صرف معاشی ہوتے تو کوئی تصادم، کوئی کشمکش اور کوئی ہنگامۂ ہاؤ ہو کرۂ زمین پر بپا نہ ہوتا۔ یہ نئے نئے نظریے جنم نہ لیتے۔ یہ تازہ بتازہ فلسفے رونما نہ ہوتے، یہ نو بنو قوانین وجود نہ پاتے اور ایک نظامِ زندگی کے پیٹ سے دوسرا نظام تولد نہ ہوتا۔ ہم لوگ بھی بس ادنیٰ حیوانات کی طرح چرتے چگتے چل بستے اور یہ تاریخ کے فلسفے مرتب کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ آیئے ان دونوں غلط فہمیوں کو صاف کرتے چلیں۔

قانونِ اعادہ و تکرار فلسفہ کا کام اگر جزئیات سے گذر کر ہمہ گیر اصول و حقائق کو دریافت کرنا ہے تو آیئے دیکھیں کہ کائنات "خطِ مستقیم" پر حرکت کرتی ہے یا اس کی فطرت "دَوری حرکت" کا تقاضا کرتی ہے؟

اصل حقیقت ارتقا ہے یا تکرار؟

مادہ کی اولاد میں شاید سب سے "کہتر بہ قامت" سالمے کا جز ہے۔ اس کی زندگی کا مطالعہ کیجیے کہ وہ کیا شہادت فراہم کرتی ہے۔ پھر دوسری طرف ان بڑے بڑے کروں کی تاریخ پر نظر ڈالیے جو خانوادۂ وجود کے بڑے بڑے رکن ہیں۔ پھر ان خاندانوں کے بڑے بوڑھوں یعنی آفتابوں کا مشاہدہ کیجیے۔ ہر جگہ "وجود" ایک پہیئے کی سی گردش میں مصروف نظر آئے گا۔ اس کے محیط کا ہر حصہ بار بار مخصوص نقاطِ مکانی کو طے کرے گا جنھیں وہ ایک بار طے کر چکا ہے۔ یہ سارا عمل قانونِ اعادہ و تکرار کے ماتحت واقع ہوتا ہے۔ مادی کارخانہ میں یہ جو تخریب و تعمیر کا ہنگامہ برپا ہے، یہ بگاڑ اور بناؤ کا جو فلم دکھایا جا رہا ہے، یہ زوال اور کمال کا جو کھیل "عناصر" کھیل رہے ہیں، یہ محدود سے محدود اور وسیع سے وسیع میدانوں میں ایک ہی شہادت فراہم کرتا ہے کہ دنیا میں "انصراف الآیات" کا ایک غیر مختتم عمل جاری ہے۔

یہ رات اور دن کا چکر، یہ موسموں کی گردش، یہ کیلنڈر کی تاریخوں اور لمحات و آنات کا الٹ پھیر، یہ پودے سے بیج اور بیج سے پودے کی نموداری، یہ گرم اور سرد ہواؤں کے چرخہ کا گھماؤ، یہ انسانی زندگی میں مسرت و الم، صحت و بیماری اور خیر و شر کے مظاہر کا دوران، یہ بھی پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یہاں ماضی استقبال کا بھیس بدل کر "حال" کے اسٹیج پر رونما ہوتا ہے۔

یہی اصول کائنات کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے انسان کی انفرادی زندگی میں کارفرما ہے۔ اس کی نفسی قوتوں کے "تضادی جوڑوں" کے ارکین بار بار عمل کی سطح پر ابھرتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں۔ اس کے احساسات میں بار بار ایک ہی طرح کے تموج رونما ہوتے ہیں۔ اس کے جذبات میں ایک ہی نوعیت کے طوفان پھر پھر کر تحریک پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ "تکرار" انسانی زندگی میں نہ ہو تو "تجربہ" کا سرے سے امکان ہی نہ رہے اور پھر علم النفس، علم الاخلاق، نہ تو تشکیل پا سکیں اور نہ سرے سے ان کی کوئی ضرورت ہی باقی رہے۔

خیر تو آگے چلیے۔ انسان کی حیات اجتماعی اور انفرادی زندگی کے درمیان عملاً کوئی لکیر آج تک نہیں کھینچی جا سکی۔

وہ بہ یک وقت ایک فرد بھی ہے اور ایک اجتماع کا رکن بھی۔ یہ تقسیم صرف نظری ہے۔ فطرت اس تقسیم کو کوئی وزن نہیں دیتی۔ وہ زندگی کو ایک وحدت کی حیثیت سے جانتی ہے۔ لہٰذا اس کے غیر متغیر قوانین کا سکہ اجتماعی زندگی پر بھی اسی طرح رواں ہے جس طرح انفرادی زندگی پر۔ فرد اور اجتماع کے حقوق کے تعین میں جو غلطیاں آج کی جا رہی ہیں وہ کئی کئی مرتبہ کی جا چکی ہیں۔ قانون کی تشکیل میں بے اعتدالی اور اعتدال کے درمیان جو ٹھوکریں صدیوں پہلے کھائی گئی تھیں وہی آج بھی انسانیت کے راستہ میں حائل ہیں۔ تہذیب کے اساسی اصول افراط و تفریط کے درمیان لنگر کی سی حرکت صدیوں سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن زندگی کے "کولھو" کے گرد پھیرنے والے "بیل" کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا ہیگل آنکھیں بند کیے ہوئے فتویٰ دیتا ہے کہ "ارتقاء ہو رہا ہے، ارتقاء!" اور اس بیل کی دم پکڑ کر بھاگنے والا مارکس پھولے ہوئے سانس کی رو میں کہتا ہے کہ — "ہاں یہ ارتقاء ہے اور اس کی وجہ ہے بیل کے معاشی حالات کا تغیر!"

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے

مجھے ایک جاپانی ضرب المثل یاد آ رہی ہے کہ:-

"اگر تم پہاڑ کی چوٹی پر بھی چڑھ جاؤ تو تمہیں وہاں بھی انسانی قدموں کے نشان ملیں گے"۔

ضرب المثل یہ بتانا چاہتی ہے کہ انسانی تاریخ میں کوئی چیز "نئی" نہیں ہے کیونکہ جو قوتیں اس کی تعمیر کرتی ہیں یعنی انسانی احساسات اور جذبات اور معاشی و عقلی مقتضیات، وہ باہمہ اختلافِ زمان و مکان یکساں ہیں۔ ان میں "خارجی ہیجانات" کے بدل جانے سے کوئی بنیادی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ یہ محبت، یہ شہوت، یہ بھوک، یہ کبریائی کی دھن، یہ جذبۂ خدمت، یہ سماج کی پاسداری، یہ ذوقِ خدا پرستی ہر عہد میں برسرِ عمل ہیں۔ چاہے ان کے دوائرِ اثر کی وسعت میں کتنا ہی سمٹاؤ اور کتنا ہی پھیلاؤ کیوں نہ ہو۔ بجائے خود ان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جو نیکی یا بدی اس کرہ پر ایک بار عمل میں آ گئی ہے وہ آج تک اپنے آپ کو دہراتی چلی آ رہی ہے اور نہ معلوم یہ "دوہراؤ" کب تک جاری رہے گا۔

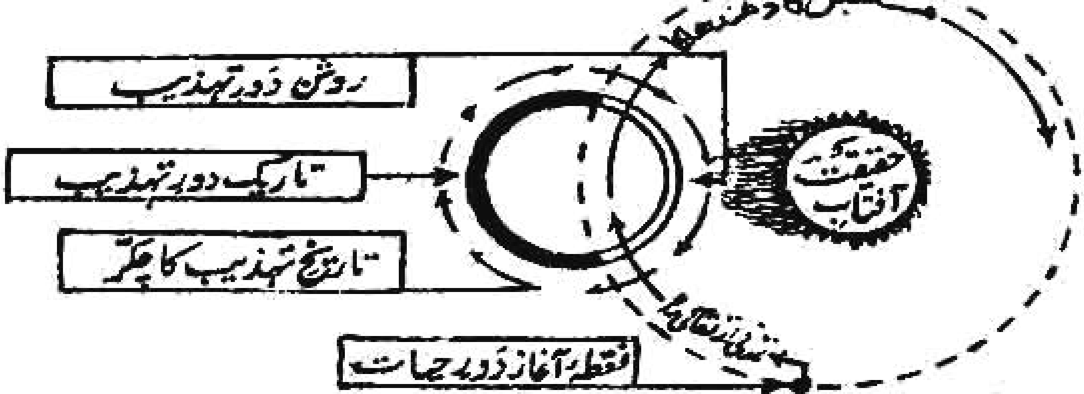
"آزمودہ را آزمودن" انسانی غلط کاریوں کی کتاب کا ایک بڑا باب ہے۔ جس طرح انفرادی طور پر

ایک آدمی غلطی کرتے ہوئے اس غلطی کے معروف انجام سے اپنے آپ کو یہ فریب دے کر آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ اس کے پچھلے فاعلوں نے ہشیاری سے کام نہیں لیا تھا اور وہ اسے دوہراتا ہے اور اس کے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی طرح اجتماعی نظام بھی طے کیے ہوئے راستے کو نئے دھج سے پھر طے کرتا ہے اور علوم و فنون و تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس کے علمبردار اپنے آپ کو اور اپنے حریفوں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے "جدید" ہے۔ اور ہماری پیش بندیاں اور احتیاطیں اتنی مستحکم ہیں کہ کسی ایسے نتیجۂ بد کا اندیشہ نہیں جو ماضی میں اس راستہ پر چلنے سے برآمد ہوا تھا۔ کل جو چیز غلط تھی اور انسانی فطرت کے موافق نہیں تھی وہ ماحول کے بدل جانے سے صحیح اور مطابقِ فطرت ہو گئی ہے ——

انسان تو یہ "کالی عینک" آنکھوں پر چڑھا لیتا ہے لیکن فطرت کی آنکھیں حوادث و احوال کو ہمیشہ صاف نظر سے دیکھتی ہیں، اور وہ اپنے فیصلے میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔ مختصر یہ کہ اجتماعی پہلو سے بھی انسانی زندگی قانونِ تکرار کی جولاں گاہ ہے۔ قانون اور اخلاق کے جزئیات ہوں یا تہذیب کے اساسی اصول، سب ایک گول چکر میں گھوم رہے ہیں اور فلسفہ اطمینان دلاتا ہے کہ ارتقا ہو رہا ہے۔

تاریخ اپنے آپ کو نہیں بھی دہراتی! لیکن فلسفہ بالکل غلطی پر بھی نہیں ہے۔ فی الواقع تاریخ کا ایک ارتقائی پہلو بھی ہے اور اسی پہلو سے تاریخ کا محدود مطالعہ غلط فہمی کا سبب بنتا ہے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انسان کے نفسی قویٰ ہر عہد میں جوں کے توں رہتے ہیں۔ فرق جو نمودار ہوتا ہے وہ ذہنی اور تمدنی ماحول میں ہوتا ہے۔ انسان کی دماغی طاقت ایجاد و اختراع کے حربوں سے خارجی دنیا کو بدلتی جاتی ہے۔ اس طرح خود نفسی قوتوں کے لیے نو بنو خارجی محرکات فراہم ہوتے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس عمل و تفاعل سے انسان کی شخصیت کو نمود کے لیے بہتر سے بہتر پیرائے حاصل ہوتے جاتے ہیں اور اس کا دائرۂ عمل وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک انسانی قوتوں کے اصولِ کار کا تعلق ہے، وہ جوں کے توں رہتے ہیں چنانچہ ان قوتوں کے اجتماعی عمل سے جو نظام ہائے حیات رونما ہوتے چلے آ رہے ہیں وہ مظاہرِ تمدن اور اسبابِ قوت کی حد تک تو ارتقا کر رہے ہیں لیکن اصولِ تہذیب اور اصولِ قانون و اخلاق کے نقطۂ نظر سے ان پر قانونِ اعادہ و تکرار ہی کارگر

روان ہے۔ ہر غلط اصول اور ہر صحیح نظریہ بار بار ابھرتا ہے۔ لیکن ہر بار اس کا چولہ بدلا ہوا ہوتا ہے اور ہر بار وہ نئے ہتھیاروں سے مسلح اور جلو میں قوت کے نئے قشونِ قاہرہ لیے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ ہے "ارتقاء" اور "تکرار" کے اضدادی جوڑے کے باہمی کارنامہ کی حقیقت۔ اس حقیقت کی وضاحت شاید ذیل کی شکل سے خوب ہو سکے گی:۔



"تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ" اور "تُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ" کا تماشا مٹی کے کرّوں کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ انسان کی اجتماعی تاریخ میں بھی دکھایا جا رہا ہے جب کبھی مابعد الطبیعی حقائق کا آفتاب براہِ راست انسانی سوسائٹی پر چمکنے لگتا ہے اور درمیانی حائلات ہٹ جاتے ہیں تو اعتدالی اصول تہذیب غالب ہونے لگتے ہیں، ایک معتدل قانونِ حیات ان اصولوں کے گہوارے میں پرورش پانے لگتا ہے اور "روشن دورِ تہذیب" کی صبح نمودار ہوتی ہے۔ یہ صبح آہستہ آہستہ دوپہر کے اوجِ کمال کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ دوسری طرف سوسائٹی کے اندر ہی اس کے قائم کردہ نظامِ زندگی کو تباہ کرنے والے عناصر بھی موجود ہوتے ہیں جو اس کے غلبہ کے وقت اسی طرح دب جاتے ہیں جس طرح کسی دوا کی چند تیز خوراکوں سے بعض مزمن امراض کے جراثیم دب جاتے ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ جہاں نظامِ رواں میں ذرا کمزوری نمودار ہوئی یہ عناصر سطح پر آجاتے ہیں اور پھلنا پھولنا شروع کر دیتے ہیں۔ تا آنکہ کچھ نئے اصولِ تہذیب، جو دراصل نئے نہیں ہوتے، فلسفہ و حکمت اور ادب و صحافت کے سانچوں میں ڈھل کر پھیلنے لگتے ہیں۔ پھر ایک افراطی یا تفریطی نظامِ حیات خود اعتدالی نظامِ حیات ہی کے پیٹ سے رفتہ رفتہ برآمد ہونے لگتا ہے اور کچھ مدت میں سیاسی تمکن حاصل کر لیتا ہے۔ یہ تاریخ تہذیب کی رات ہوتی ہے اور اسے فلسفیانہ اصطلاح میں "تاریک دورِ تہذیب"[ے] کہا جا سکتا ہے۔ پھر اس دورِ تہذیب کے مخالف عناصر جو دب گئے تھے

ے (یہ حاشیہ صفحہ ۴۸۲ پر درج ہے)

رفتہ رفتہ سر نکالنے لگتے ہیں اور انقلابی مساعی کے اسلحہ سے مسلح ہو کر اس کے خلاف زور لگاتے ہیں۔ الغرض انسانی تاریخ بار بار تاریک اور روشن دوروں کو عبور کرتی ہوئی "تمدنی ارتقاء" کے راستہ پر بڑھی چلی جاتی ہے، جس کا آغاز انسانی پیدائش سے ہوا تھا اور خاتمہ انسانی زندگی کی انتہا پر ہوگا۔

غاروں سے محلات تک، پتھر کے اوزاروں سے دھات کے آلات تک، چراغ سے بجلی تک، گھوڑوں اور ٹٹوؤں کی سواری سے ریلوں اور ہوائی جہازوں تک، برہنگی سے دیبا وحریر کے لباس تک، اشاراتی گفتگو سے شاعری اور کمالِ خطابت تک، تصویری نقوش سے پریس تک جو ایجادات عقل انسانی نے کی ہیں اُن سب میں متضاد اصولوں کے علمبرداروں نے یکساں کام لیا ہے۔ دونوں قسم کی تہذیبوں کے ذرائع و وسائلِ کار اور اسبابِ قوت میں یکساں اضافہ ہوا ہے لیکن ان کی کشمکش کا خاتمہ نہیں ہو سکا۔ غاروں میں بسنے والے ننگ دھڑنگ انسان نے بھی اس کشمکش میں حصہ لیا ہے اور آج کا انسان بھی فریقینِ جنگ میں سے کسی نہ کسی کا ساتھ دے رہا ہے۔ بیل گاڑیاں ہانکنے والے ابنِ آدم کے حالات بھی دراصل ایک محدود پیمانے پر بالکل ویسے ہی تھے جیسے وسیع پیمانے پر موٹر چلانے والے خاکی پتلے کے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس عہد کا مطالعہ کرتے ہوئے ناقد کی نگاہ براہِ راست انسان پر جا ٹھیرتی ہے کیونکہ وہاں دیکھنے کی چیز ہے ہی صرف انسان لیکن آج پہلی نظر مشینوں، گاڑیوں، ہوائی جہازوں، ریڈیو اسٹیشنوں اور بجلی گھروں کے طلسماتِ ہوش ربا میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور تمدن کی چمک دمک اتنی فرصت ہی نہیں دیتی کہ انسان کے ذہنی پہیے کے گھماؤ کو دیکھا جائے۔ یہ اوپر کا ارتقاء نیچے کے عمل تکرار کو چھپائے ہوئے ہے۔ اصل سوال یہ نہیں کہ اسبابِ حیات اور وسائلِ کار میں کتنا اضافہ ہوا۔ اصل سوال یہ ہے کہ انسان نے زندگی کی تشکیل کن اصولوں پر کر رکھی ہے۔ سو اس نقطۂ نظر سے غور کرنے والا دماغ بہرحال اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ آدمی افراط و تفریط اور اعتدال کے نقاطِ سہ گانہ کے دھرے پر گھوم رہا ہے۔

(حاشیہ صفحہ سابق) ۱ "تاریک دورِ تہذیب" بخلاف "روشن دورِ تہذیب" کے اندرونی طور پر سماجی اور سیاسی انقلاب کی جولانگاہ بنا رہتا ہے۔ اس میں "تصادم در تصادم" کے عمل سے نئے نئے سماجی اور سیاسی نظام فروغ پاتے رہتے ہیں۔ کیونکہ "راہِ اعتدال" کو چھوڑ دینے کے بعد انسان پر بے اعتدالی کی سینکڑوں راہیں کھل جاتی ہیں۔

بطورِ مثال کسی ایک اصولِ تہذیب کو لے لیجیے۔ فرد اور اجتماع کا رابطہ کیسا ہونا چاہیئے؟ یہ ایک اساسی مسئلہ ہے۔ اب آیئے اور عرب (قبل از اسلام) کی سوسائٹی کو سامنے رکھیے۔ اس میں شک نہیں کہ جاہلیت کا عرب حکومت کا کوئی واضح اور منضبط نظام نہیں رکھتا تھا لیکن یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں نظمِ اجتماعی کسی شکل میں تھا ہی نہیں اور اسے جاری رکھنے کی کوئی قوت سرے سے موجود نہ تھی۔ نظمِ اجتماعی یقیناً تھا اور اس کی اساس مسخ شدہ مذہبی مراسم و عبادات، عام اخلاقی ضوابط، آبائی رسم و رواج اور قبائلی مفاہمتوں وغیرہ پر قائم تھی۔ اس نظام نے "انفرادی آزادی" کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ یعنی اجتماعی ہیئت فرد کے سامنے بالکل بے بس اور بے وزن تھی۔ تاریخ میں یہ دور آیا اور گذر گیا۔ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ یہ پھر کبھی نہ آئے گا۔ لیکن یہ ہماری غلط فہمی ہے۔ آج پھر وہی دور عین ہماری آنکھوں کے سامنے کار فرما ہے۔ یورپ کی موجودہ تہذیب کا بنیادی اصول ہی انفرادی آزادی کی حدود کو پھیلانا ہے اور اس اصول سے وہ تمام نتائج برآمد ہو رہے ہیں جو جاہلیت کے عرب میں نمودار ہوئے تھے۔ یعنی سرمایہ داری، عیاشی، فحاشی وغیرہ۔ اب قانونِ فطرت کے مطابق روس[1] میں اس اصول کا ردِ عمل رونما ہوا ہے اور فرد کی شخصیت کو ختم کر کے پوری اہمیت سوسائٹی کو دیدی گئی ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان جو نقطۂ عدل ہے وہ اگر ابھی نگاہوں سے پنہاں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ پنہاں رہے گا۔ نہیں! شاید حالیہ جنگ کے بعد کوئی گروہ اس نقطۂ عدل کا داعی بن کر اٹھے اور تہذیب کا رُخ پلٹ دے۔

معاشی استحصال کی بیماری کو لیجیے۔ یہ روگ قبیلوی دور سے لے کر بین الاقوامی دور تک انسان کی جان کا یکساں لاگو رہا ہے۔ افراد افراد سے، قبیلے قبیلوں سے، طبقات طبقات سے اور قومیں قوموں سے بار بار یہ استحصال کرتی رہی ہیں۔ یہ استحصال کبھی تو مذہب کے مقدس جبّہ کو بدنام کرتا ہے، کبھی جاگیرداری کا بہروپ بھرتا ہے،

---

[1] روس کا انقلاب موجودہ تاریک دورِ تہذیب کا ایک اندرونی (سماجی) انقلاب ہے۔ وہ موجودہ تہذیب کے اصولوں کو یکسر نہیں بدل دیتا بلکہ سماجی تغیرات کے لیے ان میں جزوی ردوبدل کرتا ہے۔

کبھی بنکوں اور کارخانہ داریوں کے جال پھیلاتا ہے اور کبھی سیاسی جہاں گیری اختیار کرتا ہے۔ بیماری ایک ہی ہے لیکن اس کے پیرایہ ہائے ظہور جداگانہ ہیں[1]۔

مزید مثال کے طور پر انسان کے صنفی رابطہ کو لیجیے۔ دورِ وحشت میں یہ تعلق بالکل جانوروں کی طرح تھا۔ جہاں جذبات میں تحریک ہوئی صنفِ مقابل کے کسی فرد سے استفادہ کر لیا۔ لیکن اس دور سے آگے نکل کر نکاح کے معاہدے کو صنفی تعلقات کی اساس بنایا گیا۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ اب انسان اس منزل کو عبور کر کے پھر اسی صنفی انارکزم کی طرف لوٹ رہا ہے اور یہ اصول چل رہا ہے کہ شوہر سب کا شوہر اور بیوی سب کی بیوی ہے۔ دوسرے پہلو سے دیکھیے تو عورت کی حیثیت کا مسئلہ ہے۔ بیچاری "شرفِ انسانیت" اور "مظلومیت" کی منزلوں کے درمیان ہچکولے کھاتی رہتی ہے، کہیں یہ "لونڈی" کے درجہ میں نظر آتی ہے، کہیں اسے شرفِ آدمیت حاصل ہو جاتا ہے اور کہیں دوبارہ شرفِ انسانیت سے معزول ہو کر "ہوس کا کھلونا" بن جاتی ہے۔

آگے چلیے "مشورہ" اور "جمہوریت" کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیے۔ یہ نعمتِ عظمیٰ تو بالکل جدید دکھائی دیتی ہے حالانکہ عرب، یونان، اور قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان سے بھی آگے نکل جائیے اور زمانہ قبل از تاریخ میں اس کا سراغ لگائیے تو وہاں بھی جمہوریت اور شوریٰ کے تحائف موجود ملتے ہیں۔

بالکل یہی کیفیت جزئیاتِ قانونی کی ہے۔ قانون کی عالمگیر تاریخ سامنے رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حرام بارہا حلال اور حلال بارہا حرام ہوا ہے۔ نہ صرف قانون بلکہ اخلاقی جزئیات کا بھی یہی حال ہے۔ انسانی روابط کی ایک شکل پر کتنی ہی مرتبہ خوش اخلاقی کا لیبل لگایا گیا ہے اور کتنی ہی مرتبہ بداخلاقی کی مہر ثبت ہوئی ہے۔

---

[1] اشتراکیت اس بیماری کا علاج تو کرتی ہے لیکن علاج ایسا تجویز کرتی ہے جو خود بعض دوسری بیماریوں کا موجب ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح نظامِ جاگیرداری انسانی سوسائٹی ہی کے فائدے کے لیے وجود میں آیا تھا اور جسمِ انسانیت کو بعض بیماریوں سے بچانا ہی اس کا مقصود تھا لیکن اس سے بعض غیر متوقع نتائج رونما ہوئے۔ وقتی ہیجانات کی رو میں بہتا ہوا انسان جب یک رخا مطالعہ کرتا ہے تو فتنہ کا ایک دروازہ بند کرنے کے دوران میں کئی نئے دروازے کھول دیتا ہے تاآنکہ ایک نیا تاریخی تجربہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جائے

خیر اس مضمون میں جزئیات کی تفصیلی بحث کا تو موقع نہیں یہاں تو اصول تہذیب کا تصادم مدِ نظر ہے۔ لیکن اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے خود "اصولِ تہذیب" کی ماہیت کا جاننا ضروری ہے۔ یہ اصولِ تہذیب کیا ہیں؟

اصولِ تہذیب انسان کی طبعی زندگی میں مابعد الطبیعی ضروریات کا جو جوڑ لگا ہوا ہے یہ عجیب پیچیدگی کا موجب ہے۔ اس "اجتماعِ ضدین" کو دیکھ کر عقل کا سر چکرانے لگتا ہے لیکن کیا کیا جائے یہ سارا کھیل ہی اضدادی زوجین کے عمل و تعامل سے چل رہا ہے۔

آدمی اگر جانوروں کا سا دماغ لے کر پیدا ہوتا تو بات آسان تھی کہ کھایا، پیا اور چل بسے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں بات میں سے بات نکلتی ہے، سوچنا فطرت ہے، اسباب و نتائج کو ڈھونڈنا جبلّت میں داخل ہے، حقائق کا کھوج لگانا خوئے خصلت ہے کیونکہ سوسائٹی میں رہنا ہے اور "آدمیوں کی طرح" رہنا ہے۔ بچارا کارل مارکس کا "معاشی حیوان" انسان بھی واقع ہوا ہے۔ وہ ہوش سنبھالتے ہی یہ سوچنے لگتا ہے کہ میں کیا ہوں؟ زندگی کیا ہے؟ کائنات کا ہنگامہ کیوں برپا ہے؟ چرنے چگنے پر یہ اکتفا نہیں کرتا۔

یہ سوال جو انسان کے دل میں غیر واضح طور پر مابعد الطبیعی امور کے متعلق پیدا ہوتے ہیں انہی کے جواب میں جو نظریات انسان قبول کر لیتا ہے وہی اصولِ تہذیب کہلاتے ہیں۔ ان اصولوں کی بنیاد پر خاص طرز کے سماجی نظام اور سیاسی ہیئتیں قائم ہوتی ہیں اور ان اصولوں میں ادنیٰ سا تغیر کر دینے سے سماجی نظام اور سیاسی ہیئت میں بہت بڑی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ اصولِ تہذیب کی طرف رہنمائی کرنے والے سوالات یہ ہیں:۔

۱۔ زندگی کا سرچشمہ کیا ہے؟

۲۔ کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟

۳۔ زندگی اسی زمین تک محدود ہے یا یہ "رشتی دراز" ہے؟

۴۔ آدمی اپنے سے بالاتر کسی ہستی کے سامنے جوابدہ ہے یا نہیں؟

۵۔ معیارِ خیر و شر کیا ہے؟

۶۔ قانون کا سرچشمہ کہاں ہے اور انسان کے لیے قانون بنانے کا حق کیسے ہے ؟

۷۔ عقل انسانی کا میدانِ کار کہاں تک وسیع ہے ؟

۸۔ فرد اور سوسائٹی کے رابطہ کی حقیقت کیا ہے ؟

————— وغیرہ [1]

ان سوالات کے جوابات ایک نوع وہ ہیں جو فلسفہ اور شاعری کی متبائن الدعوات کتابوں میں ملتے ہیں اور ایک وہ جو الہامی ذخائرِ علم میں پیش کیے گئے ہیں اور ہر پہلو سے ہم آہنگ ہیں۔ موخرالذکر اصولِ تہذیب بار بار روشن ادوارِ تہذیب کی روح بنے ہیں اور ان کے خلاف ظنی نظریات کا جو انبار رہا ہے اس سے قسم قسم کے تاریک ادوارِ تہذیب کی نمود ہوتی رہی ہے۔ یہ دو مختلف النوعیت اصولِ تہذیب آپس میں متصادم ہیں۔ انسان کی نوعی ذہنیت ان کی پیکارگاہ ہے اور انسانوں کے مختلف گروہ ان کے آلہ ہائے کار بنتے ہیں اور تصادم در تصادم کا عمل جاری رہتا ہے۔

ایک نوعیت کے اصولِ تہذیب جب لٹریچر، نظامِ تعلیم اور صحافت کے کارخانوں میں نفوذ کرکے ایک نئی ذہنیت قائم کر لیتے ہیں تو لوگوں کے زاویہ ہائے نظر بدل جاتے ہیں، معیارِ انتخاب بدل جاتا ہے، سیاسی مذاق بدل جاتا ہے اور ہر طرف ایک ایسے نظامِ حیات کی پیاس پھیل جاتی ہے جو جدید الشیوع اصولِ تہذیب سے کلی مناسبت رکھتا ہو۔ نئی فضا میں پرانے نظام کا دم گھٹنے لگتا ہے اور آخر کار محنت و مشقت سے تیار کی ہوئی عمارت دھڑام سے گر پڑتی ہے۔

آدمی صاحبِ ارادہ و انتخاب ہونے کے باوجود ان متضاد اصولوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ اصول خود کٹھ پتلیاں ہیں اور جن تاروں پر یہ حرکت کرتی ہیں ان کا سرچشمہ دھندلا دھندلا نظر آرہا ہے۔ آیئے ذرا قریب چل کر دیکھیں کہ اس سرچشمہ کے اندر کیا ہو رہا ہے۔

---

[1] یہ سوالات چاہے بظاہر کتنے ہی غیر محسوس کیوں نہ ہوں ہر آدمی ان کے جواب میں نفیاً یا اثباتاً کوئی نہ کوئی حکم ضرور لگاتا ہے۔

ذہنِ انسانی کا مطالعہ دریا، پہاڑ، ہوائیں، چاند، سورج، تارے یہ سب کے سب غیر متغیر اصولوں کے مدار پر سرپٹ دوڑتے ہیں۔ انھیں کسی "رسہ کشی" میں حصہ نہیں لینا پڑتا۔ کتنی پُرسکون اور پُرامن زندگی ہے۔ انسان کائنات کے انھیں افراد کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر وہ کون سا فرق ہے جو اسے "تصادم در تصادم" کے چکر میں ڈال دیتا ہے۔ یہ ساری مصیبت اختیار و شعور کی ہے۔ ع

"دل لے کے ہم تو فتنہ در آغوش ہو گئے"

اور اختیار و شعور کا سرچشمہ ذہنِ انسانی ہے۔ یہی ہے اصل مطالعہ کی چیز۔

ادھر لانا ذرا دستِ حنائی
پکڑ لیں چور دل کا ہم یہیں سے

ذہنِ انسانی گوناگوں متضاد قوتوں کا منبع ہے۔ ان متضاد قوتوں کو اگر دو بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ذہن کے اندرونی عمل کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ایک لشکر تو مارکس کے معاشی حیوان کا ہے اور دوسرا اس مظلوم غیر معاشی انسان کا جسے دنیا کے اس مشہور فلسفی نے نظر انداز کر دیا۔ معاشی حیوان محض اندھی خواہشات رکھتا ہے۔ اور عقل کی مدد سے انھیں پورا کر لینے کو منتہائے مقصود قرار دیتا ہے لیکن غیر معاشی انسان اجتماعی نظم کے تحفظ کے لیے معاشی حیوان کو بعض حدود میں محدود رکھنا چاہتا ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ انسان محض تجربی عقل کی بنیاد پر صحیح ضابطۂ حیات مرتب کر سکتا ہے یا نہیں اور انسان کے ضابطۂ حیات کا مصنف کون ہو سکتا ہے۔ تاہم ضابطہ کی پیاس جو ہر فرد کو محسوس ہوتی ہے وہ بالکل فطری ہے۔ یہ نہ ہو تو اجتماعی نظم کی تشکیل ہو ہی نہ سکے۔

خیر تو یہ معاشی حیوان اور غیر معاشی انسان اندر ہی اندر اپنا اکھاڑا گرم رکھتے ہیں۔ جب خارجی محرکات کے بل پر خواہشات زور کرتی ہیں تو وہ اخلاقی حس کو دبا لیتی ہیں اور جب اخلاقی حس میں بیرونی عوامل کی وجہ سے اشتعال پیدا ہوتا ہے تو وہ خواہشات کو چت کر دیتی ہیں۔ یہ بدعہدیاں، یہ چوری چکاری، یہ فریب دہی، یہ رقص و زنا وغیرہ کے شیاطین غیر معتدل خواہشات کی موجوں پر ہی بہہ کر آتے ہیں۔ اور دوسری طرف ایثار، خدمت، فدا

کاری، احترام حقوق، اور حدود کی پاسداری کے فرشتے اخلاقی حس کے مطلع سے طلوع ہوتے ہیں۔ ایک طرف ہر عہد میں ہمیں وہ انسان ملتا ہے جو انفرادیت کی شراب سے مست ہو کر محض اپنے مفاد کے لیے انسانیت کو زخم لگاتا ہے۔ اور دوسری طرف ہمیں ہر عہد میں وہ انسان بھی نظر آتا ہے جو انسانیت کی خاطر پے درپے چوٹیں کھاتا ہے۔ یہ دونوں کردار اُس عملی تصادم کے نتائج ہیں جو دو متضاد رجحانات میں جاری ہے۔ ہر داخلی و خارجی تاثر ارادہ کی منزل تک پہنچنے سے پہلے اس کشمکش کی بھٹی سے ہو کر گذرتا ہے۔

ان متضاد اندرونی رجحانات کے "نقاط مصالحت" بے شمار ہو سکتے ہیں جو مذہب اور تجربی عقل کی مدد سے ایک فرد کے شعور کے سامنے بکھرے رہتے ہیں۔ ان نقاط میں سے ایک تو نقطۂ عدل ہوتا ہے اور اس کے دونوں پہلوؤں پر افراطی اور تفریطی نقاط متعدد ہوتے ہیں اور ان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ ماحول کے تغیرات ان میں سے بعض کو ابھار دیتے ہیں اور بعض کو شعور کی نگاہوں سے ذرا دُور ہٹا دیتے ہیں۔ اس طرح مختلف سوسائٹیوں میں مختلف فطری مطالبات کو مختلف طریقوں سے پورا کیا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ فطری مطالبات کو پورا کرنے کا ہر طریقہ صحیح اور مفید ہی ہے۔ مثلاً ایک شخص کے اندر صنفی ہیجان رونما ہوتا ہے۔ اب اس آگ کو بجھانے کے متعدد طریقے اس کے سامنے ہو سکتے ہیں۔ وہ نکاح یعنی صنفی عہد نامہ" کا طریقہ بھی اختیار کر سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ کچھ بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ وہ "زنا بالجبر" کی راہ پر بھی پڑ سکتا ہے لیکن یہ صنفِ مقابل کے حقِ آزادی میں ناجائز مداخلت ہے۔ وہ ایک بیسوا کے آستانے پر بھی سر جھکا سکتا ہے لیکن اس طریقہ سے صنفی خواہش کا اصل منصود یعنی "تناسل" قطعاً ختم ہو جاتا ہے۔ عام صنفی انارکزم کی سڑک بھی اس کے سامنے کھلی ہے لیکن اس سے "خاندان" کا وہ مرکزی ادارہ خطرے میں گھر جاتا ہے جو اجتماعی تنظیم کے پہیئے کا دُھرا ہے۔ وہ راہب بھی بن سکتا ہے اور خصّی بھی ہو سکتا ہے لیکن مصافِ زندگی سے یہ گریز فطرتِ انسانی کو ناگوار ہے۔ یہ سارے نقاط ایسے ہیں جن پر انسان کے متضاد ذہنی رجحانات کی مصالحت ممکن ہے اور ان میں سے ہر نقطہ پر مصالحت ہوتی رہتی ہے۔ انسان کا عملی اور علمی ماحول اسے کبھی کسی نقطہ کی طرف

دھکیل دیتا ہے اور کبھی کسی کی طرف۔ بایں ہمہ نقطۂ عدل ایک ہی ہے اور انسانیت ہمیشہ اسی کی طرف اشارہ کرتی رہتی ہے۔

سوچنا یہ ہے کہ کیا وجہ ہے کہ نوعِ انسانی "نقطۂ عدل" یا کسی دوسرے نقطہ پر متحد نہیں ہو جاتی؟ فطرت کی یکسانی کے باوجود ذہنی اختلافات کیوں رونما ہوتے ہیں؟ کیوں نہیں ایسا ہوتا کہ تمام دنیا کے انسانوں کے معاشی اور اخلاقی رجحانات کسی ایک نقطۂ مصالحت پر متفق ہو جائیں اور ایک مستقل توازن قائم ہو جائے؟ دراصل ذہن ہے ہی حوادث کی جولانگہ جس میں بگاڑ اور بناؤ کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس سے ہمواری اور یکسانی کا مطالبہ بے جا ہے۔ ذہن انسانی کی تشکیل میں تین بڑے عوامل حصہ لیتے ہیں:-

ا۔ وراثتی اثرات۔ ب۔ تربیت ج۔ ماحول۔

یہ تینوں عوامل ایک انسان کے تمام ذہنی رجحانات اور قویٰ کو متحرک کرتے اور اپنے سانچے میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ عوامل کوئی سے دو افراد کو بھی یکساں میسر نہیں آتے۔ ان کے تنوع کے زیرِ اثر انسانی مذاق، نقطۂ نظر اور مقاصد میں بھی تنوع رونما ہو جاتا ہے۔ یہی عوامل کسی کو محض معاشی حیوان بنا کر رہنے دیتے ہیں، کسی کو اعلیٰ انسانی مقاصد کے عشق میں ایسا مبتلا کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے "پیٹ" کو بالکل بھول جاتا ہے، کہیں "روٹی" پر قوم و ملت کو بیچ دینے والے جعفر و صادق نمودار ہوتے ہیں اور کہیں قوم و ملت یا انسانیت کے لیے فاقہ کشی کرنے والے دیوانوں کا ظہور ہوتا ہے۔ یہی ذہنی تنوع ایک سوسائٹی میں مختلف اخلاقی و قانونی تبدیلیوں کی بھوک پیدا کرتا ہے۔ پھر یہ جزئی تبدیلیاں اگر سماج کے سیاسی ادارہ کو بدلے بغیر ممکن نہ ہوں تو سیاسی انقلاب کے لیے مواد تیار ہونے لگتا ہے۔ یا اگر یہ جزئی تبدیلیاں سماجی ہیئت کی نئی تراش خراش کے بغیر رونما نہ ہو سکیں تو سماجی انقلاب کے لیے زمین ہموار ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح اگر سیاسی اور سماجی ہیئت کا کوئی مخصوص نقشۂ تعمیر اصولِ تہذیب پر ضرب لگائے بغیر فروغ نہ پا سکتا ہو تو تہذیبی انقلاب ناگزیر ہو جاتا ہے۔

بہرحال انقلاب برپا کرنے والے اصول و نظریات کو تاریخی تصادم جاری رکھنے کے لیے جتنے رنگروٹ درکار ہوتے ہیں وہ ذہنی تنوع کی وساطت سے فراہم ہوتے ہیں۔

نظریات وخیالات کی جنگ اب ہم اصل نقطۂ بحث پر آگئے ہیں. یعنی یہ کہ نظریات وخیالات کی جنگ کس طرح ہوتی ہے۔ اس سوال کو حل کرنے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ اصول ونظریات کے اولاً دو اضدادی گروہ ہیں۔ (۱) فطری حقائق جن کی بنیاد پر ایک معتدل نظام تعمیر کیا جا سکے (۲) قیاسات جن کی بنیاد پر مختلف غیر متوازن نظام کھڑے کیے جا سکیں۔ اصل تصادم ان دو گروہوں میں ہے لیکن تصادم در تصادم کا میدان وسیع ہے کیونکہ خود دوسرا گروہ افکار پھر آگے دو بڑے گروہوں میں بٹ جاتا ہے (د) وہ افکار جن کا رجحان افراط کی طرف ہے (ب) وہ افکار جن کا رجحان تفریط کی طرف ہے۔ پھر ان دونوں انتہائی سروں کے درمیان بے شمار گروہِ افکار ہو سکتے ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کی ضد ہوتا ہے اور ہر ایک دوسرے تمام گروہوں سے متصادم۔ دیکھیے شکل ذیل :۔



ان میں سے مختلف اصول ونظریات کو سوسائٹیوں میں فروغ حاصل ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ علمبردار بل جاتے ہیں جو اگر انھیں ابھار نہ سکیں تو آئندہ نسلوں کی طرف کسی نہ کسی واسطہ سے منتقل کر دیتے ہیں۔

فرض کیجیے "ج" خیال کے علمبرداروں کو "تمکن" حاصل ہو گیا ہے اور انھوں نے اپنے نظریات کی بنیاد پر ایک نظام نافذ کر رکھا ہے۔ اب "د" سے لے کر "ب" تک تمام گروہ اس نظام سے غیر مطمئن ہیں۔ ان غیر مطمئن گروہوں میں سے ہر گروہ مستقبل کے انقلاب کا علمبردار بننے کے قابل ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر نظریہ کے حامی ضرور میدانِ عمل میں اتریں اور جتنے گروہ میدانِ عمل میں اتریں، ضرور کامیاب ہو کر نکلیں۔ نہیں، ضروری اسباب کے فراہم ہو جانے سے چند قوتیں میدان میں نمودار ہوتی ہیں[1] اور باقی سطح کے نیچے سانس روکے چند سالوں یا بعض اوقات صدیوں تک اچھے موقع کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ پھر جو گروہ سطح پر تموج پیدا کرتے ہیں ان میں سے

[1] یاد رہے کہ اس ساری حرکت کے دوران میں مختلف گروہوں کے درمیان ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری رہتا ہے۔

جو کوئی اسبابِ قوت پر قبضہ پا لیتا ہے وہ دوسروں کو نگلتا جاتا ہے اور آخر کار اپنے اصولوں پر ایک نیا نظامِ زندگی قائم کر دیتا ہے۔ پھر اس کے خلاف قوانینِ فطرت کے تحت دوسری طاقتیں زور لگانے لگتی ہیں۔

اب ہمارا موضوعِ فکر یہ ہے کہ غالب ہونے والا گروہِ افکار کس راستے سے گذر کر تمدن کی قیادت پر پہنچتا ہے اور اس راستے کے سنگہائے میل کیا ہوتے ہیں؟

انقلاب کا راستہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، ہر انقلاب کی داستان انسان کے انفرادی ذہن سے شروع ہوتی ہے۔ چاہے اس انفرادی ذہن کو ایک خاص طرزِ فکر اجتماعی نظام کے موثرات ہی کے طفیل حاصل ہوتا ہو۔ پھر فرد کی "خودی" ظہور چاہتی ہے اور اپنی تجلیات کو محدود یا وسیع طریقوں سے دوسروں پر منعکس کرتی رہتی ہے۔ ہر شخص اپنے نظریات کی حفاظت اور پرورش میں کچھ نہ کچھ کوشش صرف کرتا ہے۔ چاہے یہ کوشش زبان سے ہو یا قلم سے یا عمل سے۔ مگر بڑی مشکل اسے یہ پیش آتی ہے کہ جب نظمِ اجتماعی بالکل جداگانہ اصولوں پر قائم ہو تو اس کے لیے اپنی عملی زندگی کو اپنے اصولوں کے مطابق تعمیر کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مخالفانہ اجتماعی فضا میں اس کی خودی کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ مجبور ہوتی ہے کہ حتی الامکان فضا کو بدلنے کی کوشش کرے۔ لیکن دوسری طرف نظمِ اجتماعی بغاوت برپا کر سکنے والے عناصر پر سہولتِ کار کے دروازے بالکل بند رکھتا ہے اور مسلح طاقتوں کا پہرہ ان پر بٹھا دیتا ہے۔ وہ ایک ہاتھ میں موت اور دکھ اور ذلت کا پروانہ لیے ہوئے ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں مناصب کا فرمان اور روٹی ہوتی ہے۔ بیچارا مخالف عنصر صرف یہ کہ اپنے اصولوں کی خدمت نہیں کر سکتا بلکہ الٹا اس کو دشمن کے ہاتھ اپنی پوری توتیں فروخت کرنی پڑتی ہیں۔ زبان پر قانون کی مہریں لگی ہوئی ہوتی ہیں اور قلمدانوں پر آرڈیننسوں کا سکہ جاری ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں صرف وہ لوگ "جراتِ رندانہ" سے کام لے سکتے ہیں جن کی خودی وراثتی اثرات، تعلیم و تربیت اور خارجی ماحول کے اثرات کی مدد سے بہت پختہ ہو چکی ہو۔ پھر چونکہ مادی قوت کے حصول کا راستہ تنظیم کی وادی سے ہو کر گذرتا ہے لہٰذا ایک تنظیمی قابلیت رکھنے والے لیڈر کا زمام کار کو ہاتھ میں لینے کے لیے سامنے آجانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بعد کامیابی کا

انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ قوت کے سرچشموں پر کہاں تک قابو پایا جاتا ہے۔ گویا انقلاب کے لیے حسب ذیل ابتدائی لوازم ہیں :-

ا۔ جرأت کار پیدا کرنے والے داخلی و خارجی عوامل مہیا ہو جانا۔

ب۔ افراد کے عدم اطمینان کو منظم بغاوت کی حد تک پہنچانے کے لیے ایک اچھے لیڈر کا فراہم ہو جانا۔

ج۔ قوت کے سرچشموں سے مناسب استفادہ۔

یہ سارے سامان بیک وقت ہر مکتب خیال کے پیروؤں اور ہر اصول کے علمبرداروں کو حاصل نہیں ہو جاتے اور جس کو حاصل ہو جاتے ہیں وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان تکاتب سہ گانہ پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

ا۔ ماحول | دبے ہوئے گروہ میں عموماً بزدلی، دون ہمتی، خود فروشی، جاہ پسندی، شکم پرستی اور احساس کہتری کے امراض خبیثہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اوپر سے جو طاقت غالب ہوتی ہے وہ قانون، تعلیم، لٹریچر اور آرٹ کے ذریعہ سے ان امراض کے جراثیم کو مزید کمک پہنچاتی رہتی ہے۔ اس طرح محکوموں کا چارہ صرف نومیدی جاوید رہ جاتا ہے۔ لیکن قوانین فطرت ملتوں کا ساتھ دینا چاہتے ہیں تو اس بدحالی میں امید کی شعاع نمودار ہوتی ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ لٹریچر ماضی کی روایات کا تازہ خون سوسائٹی کی رگوں میں دوڑا دیتا ہے یا ہم عصر سوسائٹیوں کے کارنامے اچانک لوگوں کو مشتعل کر دیتے ہیں یا پھر یہ ہوتا ہے کہ غالب نظام کا تشدد لوگوں میں انتہا پسندانہ رجحان پیدا کر دیتا ہے، اس کے عیوب حد درجہ آشکارا ہو جاتے ہیں اور لوگ اس کے کمزور مورچوں کو دریافت کر لیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اپنی جبلی اور وراثتی اور کسی قدر اکتسابی قابلیتوں کے بل پر زیادہ جرأت کار سے کام لینے والے افراد نمودار ہونے لگتے ہیں اور نظام غالب اور اس کے حریفوں میں کھلم کھلا تصادم شروع ہو جاتا ہے۔

بہرحال نظریات کے بیج تاریخ کی کھیتی میں چاہے کتنی دیر پڑے رہیں، کبھی نہ کبھی پھوٹتے ہیں اور ان

کے سینوں سے انقلابات کے تناور درخت نمودار ہوتے ہیں۔ یہ بیج اس وقت تک مٹی میں دبے رہتے ہیں اور اپنی قوتِ نمو کی حفاظت کرتے رہتے ہیں جب تک زمین نرم نہ ہو جائے اور وقت کی ریاست سے اس کی آبپاشی نہ ہو جائے۔ جہاں یہ دو تبدیلیاں رونما ہوئیں، انقلاب کی بسم اللہ ہو جاتی ہے۔

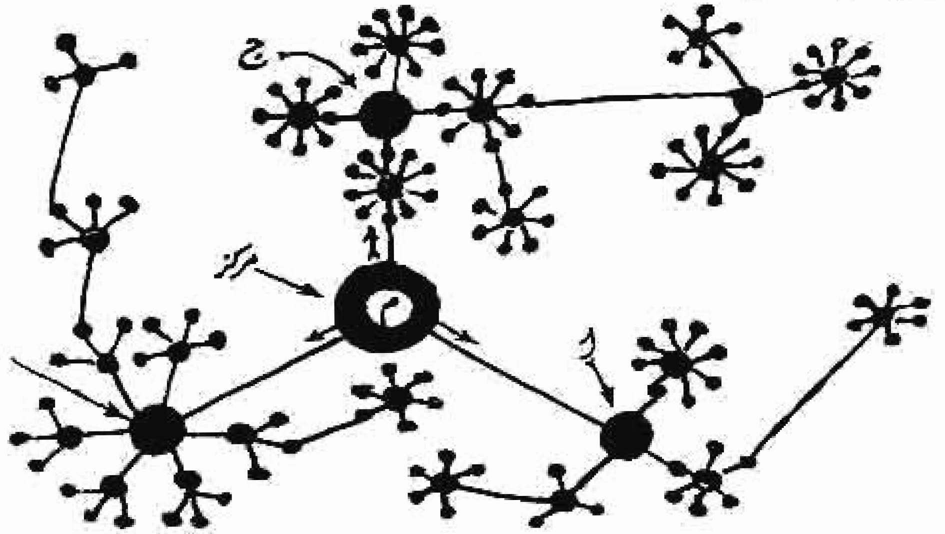
ب۔ لیڈر | اگرچہ ہر نظریہ، ہر اصول اور ہر خیال ابتداءً کسی فرد سے منسوب ہوتا ہے لیکن اس کا عملی نفاذ ایک اجتماعی منظم جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نظریہ کو برسرِ عمل ہونے کے لیے ایک ایسے لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے جو بکھرے ہوئے افراد کو ایک مرکز پر مجتمع کر کے اس نصب العین کی طرف کھینچ لے جائے جو اُن کا داعیۂ اجتماع ہو اور راستے کے حالات کے خلاف زور لگانے کے لیے "قوت" فراہم کر سکے۔

فرد جب تک فرد ہوتا ہے، اس میں بغاوت اٹھانے کے لیے جرأتِ رندانہ نہیں ہوتی لیکن کسی اجتماعی ہیئت کا پرزہ بن جانے کے بعد اس کا جوش کار منزلِ شباب پر پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے ہر انقلابی تحریک کو اعلیٰ درجہ کی دماغی و عملی صلاحیتیں رکھنے والے لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے جب حسنِ اتفاق سے مطلوبہ لیڈر اچانک اسٹیج پر آجاتا ہے تو اس کی دعوت پر ایک مکتبِ خیال کے منتشر افراد جمع ہو جاتے ہیں تاکہ "راہِ حق با کاروان رفتن" کا طریقِ عمل اختیار کیا جائے۔

لیڈر کے ظہور کا وقت وہ ہوتا ہے جب ایک مکتبِ خیال کے منتشر افراد میں اس کی پیاس بہ شدت محسوس کی جانے لگتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ لیڈر کی پیاس ہی لیڈر پیدا کرتی ہے۔ چاہے اس پیاس کے پیدا کرنے اور بھڑکانے کی مہم ہونے والے لیڈر ہی نے شروع کی ہو۔ اس پیاس کا احساس گروہوں میں نصب العین کی محبت کے غلبہ سے شروع ہوتا ہے اور اس احساس کو خوب بھانپا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اپنی موت سے پہلے ہندوستان کی ملتِ مسلمہ میں اس احساس کی نمود کا مطالعہ کر دیا تھا اور اسی مطالعہ کے نتیجہ میں ایک دعائیہ قطعہ میں نئی قیادت کی پیشگوئی کی تھی کہ :-

اگر می آید آں "دانائے رازے"   بدہ او را نوائے دل گدازے
ضمیرِ امتاں را می کند پاک   کلیمے یا حکیمے نے نوازے
(ارمغان حجاز)

بہرحال منتشر افراد بڑی سے بڑی کوشش کریں تو بھی اپنے نظریات کے تحفظ میں مدافعانہ حرکت کے سوا کچھ نہیں کر سکتے لیکن جماعتی تنظیم کے ذریعے جارحانہ کارروائی شروع ہوتی ہے۔ جارحانہ کارروائی ہی کے لیے تاریخ میں منظم جماعتیں رونما ہوتی ہیں اور تنظیمی مساعی سے فضا میں اپنا اثر پھیلانا شروع کر دیتی ہیں جماعتی خدمات کا اندازہ ذیل کی شکل سے ہو سکے گا:۔



دیکھیے ایک جماعت کا مرکز م کس طرح ایک مرکزی پاور ہاؤس کی طرح د، ب اور ج تبعی مراکز کو قوت بہم پہنچاتا ہے اور پھر یہ تبعی مراکز اپنے گرد مزید "تبع تابعین" فراہم کرتے اور انھیں قوت کا مرکز بناتے جاتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ سوسائیٹی کے اندر خاص نوعیت کے خیالات کا ایک غیر مرئی جالا سا تن جاتا ہے جس میں فرد فرد جکڑا جاتا ہے۔ اس جالے کا ساحرانہ اثر اخبار نویسوں، مصنفوں، مقرروں، اور ماہرینِ فنون کے دماغوں میں سرایت کر جاتا ہے اور ان کے ذریعہ سے ساری سوسائیٹی پر چھا جاتا ہے۔ غلط اصول ہوں یا صحیح اصول، الہامی نظریات ہوں یا فلسفیانہ قیاسات، خدا پرستی ہو یا مادہ پرستی جس کو بھی نظام زندگی کی اساس بننا ہو اس کی کامیابی کا راستہ یہی ہے۔

قوت کی فراہمی | جماعتوں کی قوت کے اسرار سر بستہ تین ہیں۔ (۱) تعدادی اکثریت۔ یعنی کوئی جماعت آبادی کے زیادہ سے زیادہ حصہ کو اپنے اصولوں کا قائل اور اپنے نصب العین کا شیدائی بنا کر اپنے اندر جذب کر لے۔

(۲) کیڈر کی یعنی جمع شدہ افراد کی سیرت کو نصب العین اور پروگرام کی ضروریات کے مطابق خاص سانچے میں ڈھال دیا جائے۔ (۳) رائے عامہ کی حمایت۔ یعنی عوام کے اس گروہ کو جو سربراہ کاری کی اہلیت نہیں رکھتا، اخلاقی طور پر اپنا معاون بنا لیا جائے۔ اس غرض کے لیے جو گروہ وسائل مروجہ کو زیادہ بہتر طریقہ پر استعمال کرے گا وہ غالب ہو نکلے گا۔ موجودہ نظام تمدن کے ماتحت تحریکیں عموماً حسب ذیل وسائل کے بل پر آگے بڑھتی ہیں۔

۱۔ پہلا وسیلۂ قوت پریس پر قبضہ کرنا ہے۔ اخبارات و رسائل جو موجودہ دور میں ذہنی انقلاب کا قوی ترین وسیلہ ہیں ان میں سرایت کیے بغیر کوئی بڑا انقلاب نمودار نہیں ہو سکتا۔ صرف اسی ذریعہ سے دنیا کی سیاسی اور سماجی حالت پر ایک نئے زاویہ سے نظر ڈالنا عوام کو سکھایا جا سکتا ہے اور تخریبی تنقید سے رائج الوقت تہذیب یا سماج، یا سیاست کے خلاف بے اطمینانی پھیلائی جا سکتی ہے اور نئے مقاصد کی طرف ذہنی رہبری کی جا سکتی ہے۔

۲۔ تعلیم۔ غالب نظام تعلیم کا ایسا نصاب نافذ کرتا ہے جو ”قتل اطفال“ کا ہم معنی ہو۔ وہ تو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اپنی ضرورت کے پرزے ڈھلواتا ہے۔ لہٰذا انقلابی جماعتوں کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی پیمانے پر مروجہ نظام تعلیم کے متوازی اپنا نظام تعلیم قائم کریں اور اس طرح نئی نسلوں کی ذہنیت کی تعمیر اپنی ضروریات کے مطابق کریں کہ انقلابی جنگ کے لیے سپاہی بھی مہیا ہونے لگیں اور مستقبل میں نئے نظام کی مشین کو چلانے کے لیے ڈرائیوروں کا قحط نہ حائل ہو۔

۳۔ جدید اختیار کردہ نظریات کی بنیاد پر لٹریچر کی تیاری۔ آج کل تعلیم کا دائرہ مدرسہ کی چار دیواری سے باہر دور تک پھیل گیا ہے۔ تعلیم یافتہ آدمی ساری عمر طالب علم بنا رہتا ہے کیونکہ زندگی کے مسائل بے شمار ہیں اور ان کے صحیح حل کی خواہش ذوقِ تحقیق اور ذوقِ مطالعہ پیدا کرتی ہے۔ ہمارے علم کی ہر شاخ اتنی وسعت اختیار کر چکی ہے کہ آج یونیورسٹیاں ”اسپیشلسٹ“ پیدا کرنے پر مجبور ہیں اور ہر تعلیم یافتہ آدمی اپنی علمی دلچسپیوں کو کسی

ایک شاخ پر مرتکز کر دیتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ایک انقلابی تحریک اپنے نظریات کو علم کی ہر شاخ میں حل کر دے وہ طبیعیات، نفسیات، اخلاق، علم السیاست، علم المعیشت، علم الاجتماع وغیرہ علوم میں سے ہر ایک کی روشنی میں اپنے اصولوں کا برحق اور مفید ہونا مبرہن کر دے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ شاعری، افسانہ اور ڈرامہ میں بھی انقلابی نظریے کا سمویا جانا ضروری ہے تاکہ جو لوگ خشک تحقیقی مذاق نہیں رکھتے یا تفکر کے لیے فرصت سے محروم ہیں اور محض تفریحی مطالعہ پر اکتفا کرتے ہیں، ان کے ذہن میں بھی نفوذ حاصل کیا جائے۔ اس علمی امامت کے بغیر دماغوں کو فتح کرنا ممکن نہیں۔

۴۔ اسٹیج پر قبضہ۔ یہ ایک آخری سنگ میل ہے۔ تقریر کا اثر بہت تیز اور وسیع ہوتا ہے۔ صحافت تعلیم اور لٹریچر تو بارود بچھانے کا کام کرتے ہیں اور خطابت اس کو فتیلہ دکھاتی ہے لیکن اس کام میں بڑی ہشیاری کی ضرورت ہے۔ اگر فتیلہ وقت سے پہلے دکھا دیا جائے تو بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے۔

اسٹیج سے انقلاب کی دعوت کو اس وقت بلند ہونا چاہیے جب "قیادت" کو ایک طرف سے تو یہ اطمینان ہو کہ عوام کی بے پناہ طاقت کو قابو میں رکھنے کے لیے سربراہ کاروں کا ایک قابلِ اعتماد گروہ موجود ہے اور دوسری طرف یہ محسوس ہو کہ ملک کی سیاسی فضا اور خارجی طاقتوں کے حالات تصادم کے لیے موافق ہو چکے ہیں

ان سارے ذرائع سے ایک انقلابی جماعت لوگوں کو ایک طرف مروجہ نظام کے خلاف سخت تنقید کر کے غیر مطمئن اور غیر مطمئن سے آمادۂ بغاوت کرتی رہتی ہے۔ دوسری طرف وہ اپنے پسندیدہ اصول و نظریات کے برحق ہونے پر تعمیری افکار پیش کر کے لوگوں کو اپنا حامی بناتی ہے۔ اسے عوام کو اس یقین کی حد پر پہنچانا ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ تمھارے لیے سراسر فائدہ پر مبنی ہے۔ اس تبلیغ افکار سے، پہلے قریب ترین لوگ متاثر ہوتے ہیں، پھر ذرا دور کے لوگ متاثر ہوتے ہیں، پھر اثر کا حلقہ مزید وسیع ہوتا جاتا ہے اور وہ مخالف عناصر بھی جماعت میں جذب ہونے لگتے ہیں۔ جو شبہات، قدامت پسندی، غلط فہمی، دیانتدارانہ اختلاف یا تعصب کی وجہ سے دور کھڑے تھے۔ حتیٰ کہ وہ آبادی جو آخر دم تک مخالفت کرتی ہے وہ بھی انقلاب کی رو کے بڑھ نکلنے کی صورت میں بے حوصلہ

و مایوس ہو کر سر جھکا دیتی ہے۔

تبلیغ افکار میں جان پڑتی ہے عمل سے۔ اگر عمل اور دعوت میں تضاد ہوگا اور تحریک کے داعیوں کی سیرت ان کی دعوت کے مطابق نہ ہوگی تو تحریک فیل ہو جائے گی۔ اور اس کا چلن اسی وقت تک رہ سکے گا جب تک ہاتھی کے دکھانے کے دانت فریب دینے کے قابل رہیں گے۔ الغرض جب انسانوں کی ایک کثیر تعداد کسی نظام پر رضامند نہیں رہتی تو اس کا چلنا محال ہو جاتا ہے چاہے وہ کیسی ہی عظیم الشان مادی قوتوں سے کیوں نہ مسلح ہو۔

نظامِ غالب اور اس کے حریف کے درمیان جو مقابلہ ہوتا ہے، اس کے بھی کچھ اصول ہیں۔ نظامِ غالب ساری جنگ مادی قوت کے بل پر لڑتا ہے وہ سنگین اور ردی کی مدد سے بازی جیتنے کی فکر کرتا ہے۔ بخلاف اس کے انقلابی تحریک اخلاقی قوت کے بل پر آگے بڑھتی ہے اور غیر متزلزل قوتِ ایمانی، اصول پرستی ایثار و قربانی اور خدمتِ انسانیت کے مظاہرہ سے عوام پر سکہ جماتی ہے۔ عوام سے اس کا رابطہ بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ عوام کی ہمدردیوں کا مرکز بن جاتی ہے۔ نظامِ غالب مجبور ہوتا ہے کہ انھیں عوام میں سے ضروری کارندے حاصل کرے۔ ان کارندوں کے پیٹ تو حکومت کے بس میں ہوتے ہیں لیکن ان کے دل و دماغ پر انقلابی تحریک کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک نظام کے انجن بالکل اپنے دشمنوں کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔ رہی سہی جو کسر ہوتی ہے وہ اندرونی فوجی بغاوت یا کسی بیرونی حملہ کی مدد سے پوری ہو جاتی ہے اور تاریخ میں اس کے لیے بار بار مواقع پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

انقلابات کی اقسام | انقلابات کا دائرہ جتنا محدود ہوتا ہے، اتنی ہی کم جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے اور اس دائرہ میں جتنی وسعت ہوگی، جدوجہد بھی اتنی ہی سخت کرنی پڑے گی۔ انقلاباتِ عالم کو اگر اس لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو ان کو تین بڑے عنوانوں کے ماتحت جمع کیا جا سکتا ہے:-

ا۔ حکومتی انقلابات۔

ب۔ سماجی انقلابات۔

ج ۔ تہذیبی انقلابات ۔

محض حکومتی انقلابات کے داعی مروجہ اصولِ تہذیب اور سماج کی اساسی ہیئت سے تو مطمئن ہوتے ہیں لیکن بعض جزئی تغیرات کی خواہش کو جو حالاتِ وقت کے ماتحت بھڑک اٹھتی ہے، سیاسی ہیئت برسرِ عمل نہیں آنے دیتی تو لوگوں کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس سیاسی ہیئت کو بہ جبر توڑ کر ایک نئی سیاسی ہیئت قائم کریں۔ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ سیاسی ہیئت کے بدل جانے سے سماجی ہیئت میں رفتہ رفتہ بہت بڑے تغیرات واقع ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات اصولِ تہذیب پر اثر جا پڑتا ہے۔ اس کی مثال کے لیے تاریخ میں بے شمار انقلابات کی داستانیں محفوظ ہیں۔ قریب ترین دور میں سے آپ جرمنی کے انقلاب کو سامنے رکھ لیجیے۔ نازی پارٹی دراصل اس لیے وجود میں نہیں آئی تھی کہ اسے سماجی ہیئت کو توڑنا ہے بلکہ وہ "جمہوریت" کی پالیسی کو ملک کے لیے مضر سمجھتی تھی اور اس پالیسی کو ختم کرنے کے لیے اس نے مروجہ سیاسی ہیئت کو توڑ ڈالا۔ یہ الگ بات ہے کہ نئی سیاسی ہیئت کے پیٹ سے خود بخود سماج کا ایک نیا ڈھانچہ برآمد ہو گیا۔

رہے سماجی انقلابات، تو ان کے علمبرداروں کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ نظامِ زندگی میں کچھ مرکزی تبدیلیاں کی جائیں لیکن یہ لوگ مروجہ اساسِ تہذیب سے متفق ہوتے ہیں۔ تاہم ان کے لیے بھی ناگزیر ہوتا ہے کہ حکومت کے اس نظام پر حملہ آور ہوں جو مروجہ نظامِ زندگی کے متعصبانہ تحفظ کے لیے وجود میں آتا ہے۔ اس کی مثال انقلابِ روس ہے۔ اشتراکیت، الحاد، زندگی بعد موت سے انکار، انسان کے حیوانی تصورِ حیات اور "زندگی برائے زندگی" وغیرہ اکثر اصولِ تہذیب میں سلطنتِ برطانیہ اور یورپ بالکل متفق ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ فرد اور سوسائٹی کی حدودِ عمل میں یورپ سے اختلاف کرتی ہے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ اس کے بغیر سوسائٹی کا معاشی نظام اس نقشہ پر کھڑا ہی نہیں کیا جا سکتا جو اشتراکیت مرتب کرتی ہے۔ برطانیہ کی مدبرانہ جمہوریت سے لے کر امریت تک اور آمریت سے لے کر مزدوروں کی خداوندی تک ایک ہی دورِ تہذیب کا سکہ رواں ہے۔ یہ سارے انقلاب اور تغیر اندرونی ہیں اور ابھی تک انسانیت کو ایک دور سے دوسرے دور میں منتقل کرنے والا انقلاب رونما نہیں ہوا ہے۔

بخلاف مذکورۃ الصدر دونوں قسم کے انقلابات کے تہذیبی انقلاب نظامِ حیات کو جڑ سے بدل کر تہ و بالا

تک بدل دینا چاہتا ہے۔ یہ نہ مروجہ اصولِ تہذیب سے راضی ہوتا ہے، نہ سماج کے خارجی ڈھانچہ سے اتفاق کرتا ہے اور نہ نظامِ سیاسی سے مطمئن ہوتا ہے۔ اس نوعیت کے انقلاب کی مثال عرب کا "اسلامی انقلاب" ہے۔

ان سب میں سے اول الذکر سہل ترین اور آخر الذکر مشکل ترین ہے۔ اول الذکر کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ کسی اندرونی فوجی بغاوت یا کسی خارجی طاقت کی امداد سے ضروری تغیر برپا کر لے لیکن ثانی الذکر اور ثالث الذکر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سوسائٹی کو پہلے اپنے پروگرام سے متحد کر لے ورنہ حکومت پر قبضہ پا لینے کے بعد بھی اصل مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ پھر ان دونوں میں سے پہلے انقلاب کی تو یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ایک قوی پارٹی سیاسی غلبہ پا کر بہ جبر لوگوں پر ایک سماجی ہیئت کا نفاذ کر دے جیسا کہ روس میں عملاً ہوا ہے کہ ملک کی کثیر آبادی انقلاب کے خلاف تھی لیکن ایک فعال جمعیت نے جب قوت کے سرچشموں پر قابو پا لیا اور خون کے سیلاب بہا کر اپنا سکہ جما لیا تو لوگوں کے لیے سرِ انقیاد جھکا دینے کے سوا چارہ نہ رہا لیکن دوسرا انقلاب جبر کی راہ سے کامیابی حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ کوئی مخصوص اصولِ تہذیب بہ جبر دماغوں میں نہیں اتارے جا سکتے۔ تہذیبی انقلاب کا بیج تو "عین روح" میں بویا جاتا ہے، پھر وہ ایک وقت لے کر پھوٹتا ہے، پھر رفتہ رفتہ آخر میں "کلمہ طیبہ" ہو یا "کلمہ خبیثہ" برگ و بار لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ثالث الذکر انقلاب کو بہت بڑی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور اسی لحاظ سے اسے بہت زیادہ قوت فراہم کرنی پڑتی ہے۔

میدانِ مقابلہ کی وسعت

انقلاب کی نوعیت کے علاوہ میدانِ مقابلہ کی وسعت بھی ایک اہم مسئلہ ہے جو قوت کی ضرورت کو گھٹاتی بڑھاتی ہے۔ تاریخ عالم نظریات کے میدانہائے مقابلہ کے لحاظ سے تین بڑے حصوں میں منقسم ہے

ا۔ قبائلی دور۔ ب۔ قومی دور۔ ج۔ بین الاقوامی دور۔

قبائلی دور میں اجتماعی انقلاب بالکل غیر محسوس ہوتا تھا، اتنا غیر محسوس کہ ہم بین الاقوامی دور کے لوگ اس پر اجتماعی انقلاب کے الفاظ کا اطلاق موزوں نہیں سمجھتے۔ قبائلی دور کے تنگ سے میدانِ عمل میں نظریات کی کشمکش بالکل چھوٹی چھوٹی قوتوں کے بل پر جاری رہتی تھی اور تاریخ کے پہیے کا محیط بہت چھوٹا تھا اس لیے ادل بدل تیزی سے

ہوتا تھا اور دو انقلابات کے درمیان امن و سکون کی مدت بہت مختصر ہوتی تھی۔ اس دَور میں کسی نظریے کا معیارِ خیر و شر قبیلوی مفاد تھا۔

پھر قومی دَور آیا اور قبیلے ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر اقوام کی شکل اختیار کر گئے۔ اور جہاں پہلے افراد کے درمیان کھینچا تانی ہوتی تھی وہاں اب بڑی بڑی پارٹیوں کے درمیان تاریخی کشمکش شروع ہو گئی۔ اب نظریات کی پرکھ قبیلوی نقطۂ نظر کی بجائے "قومی مفاد" کے نقطۂ نظر سے ہونے لگی۔ تاریخ کے چکر کا محیط پھیل گیا۔ انقلابات کا دورانی وقفہ اسباب تمدن نے بڑھا دیا اور انقلابی تحریکیں بہت زیادہ قوت کی محتاج ہو گئیں۔

لیکن آج ایجادات و اختراعات اور تمدن کی ترقی نے قوموں اور ملکوں اور نسلوں کے درمیان کی دیواریں ہٹا دی ہیں۔ نظریات کی کشمکش کا میدان اب عالمگیر ہے۔ پوری نوعِ انسانی "ملتِ واحدہ" کی شکل میں تحلیل ہو رہی ہے۔ اس لیے آج نظریات کی پرکھ قومی مفاد کی کسوٹی کی بجائے انسانیت کے مجموعی مفاد کی کسوٹی پر ہو رہی ہے اور قومی مفاد کے پرستار بھی مجبور ہیں کہ انسانیت کا نام لے کر میدان میں اتریں اور عالمگیر اصلاح کا جھنڈا بلند کریں۔ اب میدان عالمگیر جماعتوں کے ہاتھوں میں جا رہا ہے۔ بڑے بڑے منظم گروہ جدید ذرائع سے دوسرے گروہوں میں نفوذ کر رہے ہیں۔ آج جو گروہ بھی کوئی آواز بلند کرتا ہے اسے دنیا بھر کے نظاموں پر تنقید کرنی پڑتی ہے، اسے اپنے مجوزہ نظام کے حق میں پبلک کی حمایت حاصل کرنے کیلئے یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ یہ نظام فی الواقع انسانی زندگی کے لیے بہترین ہے۔ لہٰذا اس دَور میں کسی انقلاب کی علمبرداری کے لیے بڑی وسیع طاقت درکار ہے۔

خود ہندوستان کو دیکھیے۔ یہاں انگلینڈ کی سرمایہ دارانہ جمہوریت، جرمنی کی آمریت اور روس کا سوشلزم رسہ کشی میں مصروف ہیں۔ اب اگر ان کے مقابلہ میں اسلامی انقلاب کے داعی بھی اٹھیں تو انہیں حکومتِ متسلطہ پر جھپٹنے سے پہلے ان سارے نظریات کی قوتوں سے متصادم ہونا پڑے گا۔ پھر یہ انقلابی عناصر تو سیاسی یا سماجی ہیئت کو بدل دینے پر اکتفا کرتے ہیں لیکن اسلام اصولِ تہذیب، سماجی ہیئت اور سیاسی ادارہ سب کچھ بدل دینا چاہتا ہے۔ وہ تو پوری عمارت کو گرا کر ایک نئے نقشہ پر تعمیر کرنے والا ہے تاکہ موجودہ تاریک دَورِ تہذیب کے یہ خون خرابے، یہ ردّ وبدل، یہ ہاتھا پائیاں ختم ہوں اور ایک روشن دورِ تہذیب نمودار ہو جس میں انسان امن، آزادی اور اطمینان کا سانس لے سکے۔

اس دور میں اگر کوئی شخص اپنے خاندانی مفاد کے لیے لوگوں کو اپیل کرے تو آپ اسے احمق سمجھتے ہیں لیکن آپ خود انسانی مفاد کے بجائے قومی مفاد کا جھنڈا بلند کر کے یہی حماقت کر رہے ہیں۔ "آزاد ہندوستان"[ل] سے صرف ہندوستانیوں کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ "رام راج" صرف ہندوؤں کو اپیل کر سکتا ہے۔ "پاکستان" کا نعرہ صرف مسلمانوں کے دماغوں پر فتح پا سکتا ہے لیکن دنیا کو مخاطب کرنے کے لیے ایک "امت وسط" کی ضرورت ہے۔ یہ منصب خالی پڑا ہے۔ اور اس طاقت کے لیے خالی ہے جو بڑھ کر اس پر قبضہ کرے۔

"جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے"

یہ کام اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک نئی "تہذیبی امامت" کا سرچشمہ ابلنے لگے اور ایک نئی "روحِ عصر" نمودار ہو جو دنیا کی ذہنی فضا میں سرایت کر جائے اور اس میں ہر سانس لینے والا اسی طرح متاثر ہو کر رہ جائے جس طرح آج تک یورپ کی "الحادی روحِ عصر" سے کرۂ ارضی پر بسنے والا ہر شخص کم و بیش متاثر ہوتا رہا ہے۔

موجودہ تاریک دورِ تہذیب پر "دردِ زہ" کے جو دورے پڑ رہے ہیں یہ اپنی واضح علامات سے ایک مردہ بچے کے برآمد ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور گمانِ غالب یہی ہے کہ یہ "ہونہار بچہ" اپنے ساتھ ماں کو بھی لے ڈوبے گا۔ تاریکی کی نسل کے اس انقطاع سے ایک نئے دورِ تہذیب کے ظہور کا راستہ کھل جائے گا لیکن اس کا انحصار اس پر ہے کہ زندگی کے پاکیزہ اصولوں کو جانیں لڑانے والے بے لوث سپاہی ہاتھ آتے ہیں یا نہیں؟ ورنہ شر کی قوت "ابلیس کے تعویذ" سے پھر سنبھل سکتی ہے یا کم از کم تاریخ کے دو دوروں کے درمیان ایک ایسا "ٹھیراؤ" حائل ہو سکتا ہے جو ہونے والے واقعات کو ملتوی کر دے اور کام کرنے والی متضاد قوتیں ایک بہترین موقع

[ل] ہندوستان کی ہر سیاسی طاقت اس لائن پر کام کرنا چاہتی ہے کہ پہلے قوم کو اپیل کر کے حکومت کی مشینری پر قبضہ کیا جائے اور پھر کوئی وسیع تر پروگرام سامنے نکالا جائے۔ حالانکہ ایک وسیع تر پروگرام پر بھی قوم اور قوم سے باہر کے لوگوں کو اپیل کیا جا سکتا ہے اور ایک جہانگیر پروگرام کے نام سے بھی حکومت کی کل پر قبضہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اصل قوتِ عاملہ تو عوام کا ایک نصب العین پر دل و جان سے متحد ہو جانا ہے چاہے یہ نصب العین قومی ہو یا انسانی۔

گنوادیں۔ یہ وقت اصل میں تاریخ کو آگے دھکیلنے کا ہے۔ جو گروہ بھی یہ خدمت سرانجام دے گا تاریخ سازی کے منصب پر وہی فائز ہو جائے گا۔

بہر حال زندگی کی پیکارگاہ میں جو شخص اتار دیا گیا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے منصب کا خود یقین کرے وہ سوچ لے کہ مختلف نظریات میں سے وہ کس کے لشکر کا سپاہی یا سپہ سالار بن سکتا ہے یا کیا اسے محض تماشائی بن کے رہنا پسند ہے؟ یہ زندگی کی پونجی کدھر صرف کی جاتی ہے؟

در سرائے ہست و بود آئی؟ میا — از عدم سوئے وجود آئی؟ میا
ور بیائی چوں شرار از خود مرو — در تلاش خرمنے آوارہ شو
تاب و تب داری اگر مانندِ مہر — پا بنہ در وسعت آبادِ سپہر
کوہ و مرغ و گلشن و صحرا بسوز — ماہیاں را در تہِ دریا بسوز
سینۂ داری اگر درخورِ تیر — در جہاں شاہیں بزی شاہیں بمیر

اطلاع

اخبار "زمزم" لاہور جو حکومت کی بعض پابندیوں کی بنا پر بند ہو گیا تھا، اب پھر جاری ہو گیا ہے

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے ان مضامین کا مجموعہ، جو مسئلۂ جبر و قدر کی تحقیق پر "ترجمان القرآن" میں شائع ہوتے رہے ہیں، اب پہلی مرتبہ کتابی شکل میں طبع ہو کر آگیا ہے۔ جن صاحب کو ضرورت ہو طلب فرما سکتے ہیں

منیجر مکتبہ "ترجمان القرآن" دارالاسلام جمال پور ضلع گورداسپور

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۲۸)

یہ نازک دماغ لوگ دیہاتیوں کو انقلاب کے لیے تیار بھی نہ کر سکے اور دوسری خدمات سے بھی محروم رہے۔ ہم اس قسم کا تجربہ دہرانے کی ہمت نہیں رکھتے۔

اس گزارش کا مدعا یہ ہرگز نہیں ہے کہ دیہاتیوں میں کام نہ کیا جائے یا عوام کی اصلاح کا کام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جو لوگ اس کام کی صلاحیتیں رکھتے ہوں وہ ضرور اس میدان میں اپنی خدمات کو معروف رکھیں اور عوام کو اپنے ساتھ کھینچ لے چلنے کی جدوجہد کریں۔ پہلے بھی ہمارے کچھ ارکان عوام میں تحریک کو پھیلانے کا تجربہ کر رہے ہیں اور ان کی عملی واقفیت سے فائدہ اٹھا کر دوسرے مقامات پر بھی یہ مہم شروع ہونی چاہیے۔ مگر جو لوگ دیہاتیوں اور عوام کی ذہنیت سے ناواقف اور ان سے خطاب کرنے کی اہلیت سے کورے ہوں اور اہل دماغ طبقہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں انھیں اپنی توتیں اسی طبقہ کی اصلاح میں صرف کرنی چاہییں، اور اس طبقہ کی اصلاح کو کوئی معمولی درجہ کا کام نہ سمجھنا چاہیے۔ فی الواقع اس طبقہ کے ایک آدمی کی اصلاح، طبقۂ عوام کے ہزار آدمیوں کی اصلاح سے زیادہ وزنی ہے۔ علمی اور تعلیمی پہلو سے دین کی خدمت انجام دینے کی قابلیت رکھنے والے لوگ اپنے اوپر اور اپنے مقصدِ زندگی پر ظلم کریں گے اگر ان کاموں کو چھوڑ کر دیہات کے چکر لگانے لگیں گے یا مزدوروں کی بستیوں میں گھومنا شروع کر دیں گے۔ ہر آدمی اپنی صلاحیتوں کو سمجھے اور ان کے مطابق اپنے میدانِ کار کی حدبندی کر لے۔ اس طرح ہر پہلو کو مضبوط کر کے ہم کامیاب پیش قدمی کر سکیں گے۔"

اس تقریر کے بعد مختلف مقامات کی جماعتوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے حلقہ کی رپورٹیں پیش کیں اور تفصیل کے ساتھ بتایا کہ وہاں اب تک کیا کام ہوا ہے، کس قسم کے لوگ جماعت میں آئے ہیں، مقامی آبادی میں ہماری دعوت کا اثر کس حد تک پھیلا ہے، دعوت کی ترقی میں کس کس قسم کی مشکلات اور رکاوٹیں حائل ہیں اور دعوت کے کیا کیا طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔

یہ سلسلہ ابھی چل رہا تھا کہ پہلی نشست ختم ہو گئی۔ دوسری نشست اسی روز ظہر کے بعد ہوئی اور اس میں بھی ابتداءً

کچھ وقت بقیہ رپورٹیں پڑھنے پر صرف ہوا۔ اس کے بعد ان رپورٹوں پر بحث و تبصرہ ہوتا رہا جو کمزوریاں نظامِ جماعت میں نظر آئیں ان پر امیرِ جماعت نے گرفت کی اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔ مثلاً بعض مقامات پر نامناسب یا خام آدمیوں کو بے احتیاطی کے ساتھ جماعت میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کے متعلق ہدایت دی گئی کہ اس طرح جو لوگ تحریک کو اچھی طرح سمجھے بغیر جماعت میں آ گئے ہیں اور جن کے اندر کوئی نمایاں اخلاقی تبدیلی نہیں پائی جاتی ان کو پختہ کرنے کی کوشش کی جائے اور پھر بھی جن کے اندر خامی رہ گئی ہو ان سے درخواست کی جائے کہ نظامِ جماعت سے باہر رہ کر ہر ممکن طریقہ سے ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ نیز آئندہ صرف انہی لوگوں کو جماعت میں لیا جائے جنھوں نے اچھی طرح جماعت کے مسلک کو سمجھ لیا ہو، جو دستور کی روح کو جذب کر چکے ہوں اور جن کے اخلاق اور سیرت میں ضروری تبدیلیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہوں۔

اسی طرح جہاں دعوت کے طریقوں میں کوئی کمزوری پائی جاتی تھی امیرِ جماعت نے اس پر بھی گرفت کی اور تفصیل کے ساتھ بتایا کہ دعوت کا صحیح طریقہ کیا ہے نیز دعوت کی راہ میں جو مختلف رکاوٹیں اور مشکلات بیان کی گئی تھیں ان کو دور کرنے کی تدابیر کیا ہیں۔ مثلاً آپ نے ہدایت کی کہ عوام میں سردست صرف دین کی حقیقت اور دینداری کے اصل مفہوم کی تبلیغ کی جائے۔ آخری اور انتہائی مقتضیات کو پیش کرنے میں بھی احتیاط سے کام لیا جائے۔ فی الحال تمام تر زور توحید اور اطاعتِ خدا و رسول کی دعوت پر اور اس تبلیغ و تلقین پر صرف کرنا چاہیے کہ لوگوں کے اندر خدا کے سامنے اپنی جوابدہی اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہو جائے۔ دعوت کے سلسلہ میں اس امر کا بھی خاص لحاظ رکھنا چاہیے کہ داعی اپنے آپ کو کسی خاص نظامِ جماعت سے وابستگی رکھنے والے مبلغ کی حیثیت سے پیش نہ کرے اور نہ نظامِ جماعت کی طرف اپنی تقریروں یا گفتگوؤں میں عام دعوت دے۔

جو لوگ تعلیم یافتہ طبقہ میں کام کریں انھیں بحث و مناظرہ کے بجائے لٹریچر کی اشاعت میں کوشش صرف کرنی چاہیے۔ ہر شخص جس سے سابقہ پیش آئے اس کی ذہنیت کو ملحوظ رکھ کر جماعت کے لٹریچر میں سے خاص خاص چیزیں ایک صحیح ترتیب سے اس کے مطالعہ کے لیے تجویز کی جائیں۔ اس کے بعد جن امور کی مزید تفہیم کی ضرورت پیش آئے ان

زبانی گفتگو کرلی جائے۔ لیکن جہاں گفتگو کا رخ بحث و مناظرہ کی طرف مڑتا نظر آئے وہاں مزید پیش قدمی سے صاف انکار کر دینا چاہیے اور اپنے آپ کو دماغی کشتی کے فتنہ میں مبتلا ہونے سے بچانا چاہیے۔ جو لوگ دوسری جماعتوں کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں یا اپنے نظری معتقدات میں غلو رکھتے ہیں انھیں خواہ مخواہ کھینچنے اور ایسی بحثیں چھیڑنے سے سخت پرہیز کیا جائے جو ان کے اندر ضد پیدا کرنے والی ہوں۔

جہاں مخالفتیں اور رکاوٹیں پائی جاتی ہوں وہاں دیکھ لیا جائے کہ آیا یہ چیزیں کسی غلط فہمی کی بنا پر ہیں یا ہمارے مقصد اور مسلک کو ٹھیک ٹھیک جان لینے کے بعد قصداً مخالفت کی جا رہی ہے۔ اگر پہلی صورت ہو تو معقول طریقوں سے غلط فہمی کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے اور جہاں محسوس ہو کہ دوسری صورت ہے وہاں صبر جمیل ہی سے کام لیا جائے۔

ان ضروری ہدایات کے خاتمہ پر امیر جماعت نے رفقاء سے کہا کہ "جو بات میں خاص طور پر آپ کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تبلیغ صرف تقریر یا گفتگو یا تحریر ہی کے ذریعہ سے نہیں ہوا کرتی بلکہ اصل تبلیغ وہ ہوتی ہے جو ایک تخیل کے داعی اپنی پوری زندگی سے ہر آن کرتے رہتے ہیں بشرطیکہ ان کی زندگی اس تخیل کا مجسم ظہور اور اس کی زندہ شہادت بن گئی ہو۔ آپ جس تخیل کے داعی ہیں اگر اس کے سانچے میں آپ کی زندگی پوری طرح ڈھل جائے تو اس تخیل کے خلاف چلنے والی دنیا میں آپ کی حالت ایسی ہوگی جیسے ایک گول سوراخ میں چوکھونٹی میخ جو اپنے پورے وجود سے ہر آن ہر زاویہ پر اس گول سوراخ کے پورے وجود کے ساتھ متصادم ہوتی رہتی ہے اور ہر وقت اپنے اور اس کے اختلاف کا مظاہرہ کرتی رہتی ہے۔ یا جیسے برف خانہ میں چند دہکتے ہوئے انگارے جو اگر کوئی آواز بلند نہ کر رہے ہوں تب بھی ان کا وہاں محض موجود ہونا ہی بجائے خود برف کے تودوں کے خلاف مستقل اعلان جنگ ہے۔ اگر ان کے ارد گرد کوئی آتش گیر مواد موجود ہوگا تو وہ کسی وعظ کے بغیر ان سے اثر لے کر مشتعل ہو جائے گا اور برف خانہ آتشکدے میں تبدیل ہو کر رہے گا۔ بے شعوری کے اسلام اور منافقانہ اسلام کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص اخلاص کے ساتھ شعوری طریقہ سے اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی افکار، اخلاق، معیشت، معاشرت، تمدن، غرض ہر شعبہ زندگی میں اپنے غیر اسلامی ماحول سے اس کا تصادم شروع

ہو جاتا ہے۔ اس کو یہ ماحول، اور اس ماحول کو وہ ہر وقت کھٹکتا ہے۔ اس کی پوری ہستی فضائے جاہلیت کے خلاف ایک احتجاج بن جاتی ہے اور اس فضا میں وہ اس طرح اجنبی و نامانوس ہو کر رہ جاتا ہے جیسے سیاہ چادر پر سفید دھبہ۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کفر و جاہلیت کے مارے ہوئے ماحول میں آپ بھی کچھ بن کر رہ جائیں تاکہ اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں اس نظام کے ہر جزء سے ہر ہر قدم پر آپ کا تصادم ہو اور اپنے پورے وجود سے آپ اس کے خلاف ایک مستقل اعلانِ جنگ بن جائیں۔ یہ ہر آنی و ہر جہتی کشمکش اور یہ ہر لحظہ کا خاموش تصادم ہزار خطبوں، تقریروں اور مقالوں سے زیادہ وزنی ہے، بلکہ درحقیقت یہی اصل چیز ہے اور اس کے بغیر تبلیغِ افکار کی مہم سر انجام نہیں پا سکتی۔

ان پر مغز مشوروں کے بعد آپ نے رفقاء کی ایک بڑی اور عام کمزوری کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ مختلف جماعتوں سے آنے والے لوگ اپنے ساتھ اپنی پچھلی گروہی اور سیاسی زندگیوں کے اثرات لے آئے ہیں۔ ان میں اب تک سابق جماعتی تعصبات کا اثر موجود ہے۔ مثلاً جو گروہ کانگرس سے نکل کر آیا ہے وہ اگرچہ کانگرس کے حق میں اثباتی تعصب نہیں رکھتا ہے لیکن لیگ کی مخالفت کا رجحان ان کے دماغوں میں واضح طور پر باقی ہے۔ یہی حال لیگ سے آنے والے حضرات کا ہے۔ پھر جو لوگ مخصوص مذہبی گروہوں سے ٹوٹ کر آئے ہیں ان میں بھی ان گروہوں کے خلاف اچھا خاصا تیز جذبۂ مخالفت پایا جاتا ہے جن سے لڑنے میں ان کی عمریں گزری ہیں۔ ان مختلف تعصبات کے حاملین جب کبھی مل بیٹھتے ہیں اور بحث و مذاکرہ کا سلسلہ چل نکلتا ہے تو بسا اوقات یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ ان کی باہمی گفتگو میں سابق عصبیتوں کو اسی طرح تازہ نہ کر دیں جس طرح اوس و خزرج کے لوگوں میں منافقین کا چھوڑا ہوا ایک شوشہ جنگ بعاث کے اثرات تازہ کر دیتا تھا۔

اس تبصرہ کا سلسلہ تیسری نشست تک جاری رہا۔ اس کے بعد تیسری نشست میں صوبہ کے کام کی تنظیم کے متعلق مشورہ ہوا۔ مشورہ کے دوران میں اندازہ ہوا کہ اس امر کی ضرورت بہ شدت محسوس کی جا رہی ہے کہ صوبۂ بہار میں کم از کم ایک قیم جماعت ضرور ہونا چاہیے جو مستعد اور فرض شناس ہو اور مختلف مقامات کی جماعتوں اور متفرق ارکان کے ساتھ ربط ضبط رکھے۔ ان کی کارروائیوں سے واقف رہے، وقتاً فوقتاً ان کو جمع کرتا رہے اور کبھی کبھی خود ان کے پاس پہنچ رہے۔ اس غرض کے لیے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی موزوں ترین ہو سکتے تھے لیکن افسوس ہے کہ ان کی صحت اس کی

اجازت نہیں دیتی۔ اس لیے تجویز کیا گیا کہ بہار کی جماعتوں کے ارکان جلدی سے جلدی آپس میں مشورہ کرکے ایک قیم جماعت کا انتخاب کریں۔

دوسری چیز جس کے متعلق مختلف مقامی جماعتوں کے امراء کو ہدایت کی گئی یہ تھی کہ اپنے حلقہ کے ارکان کی صلاحیتوں کا صحیح صحیح اندازہ کرکے ان سے کام لیں اور جمعہ کے اجتماع کا شدت سے التزام کریں۔ جو لوگ بلا عذر معقول جمعہ کے اجتماع میں نہ آئیں ان کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ جماعت سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ جمعہ کے اجتماعات سے حسب ذیل طریقوں سے استفادہ کیا جائے:۔

۔ جماعت کی طرف سے شائع ہونے والے لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے۔ نہ صرف تازہ شائع ہونے والی چیزوں کا بلکہ پرانی چیزوں کا بھی تاکہ ان کے مضامین بار بار ذہن میں تازہ ہوتے رہیں۔ خصوصاً دستور کو وقتاً فوقتاً اجتماعات میں پڑھا جاتا رہے۔

۲۔ پسماندہ رفقاء کو اٹھانے اور ابھارنے اور ہمدردی و اخلاص کے ساتھ ان کی کمزوری کو رفع کرنے کی سعی کی جائے۔

۳۔ دعوت کو مختلف حلقوں میں پھیلانے کی تدابیر پر غور و خوض کیا جائے۔

۴۔ ہر فرد نے پچھلے ہفتہ میں جو کام کیا ہو اس کو وہ پیش کرے اور دوسرے ارکان یا تو اس سے استفادہ کریں یا اگر اس کے طریق کار میں کوئی غلطی پائیں تو اس کی اصلاح کریں یا اگر اس کو مشکلات پیش آئی ہوں تو ان کا حل تلاش کریں۔

۵۔ دعوت کی راہ میں جو مزاحمتیں پیش آرہی ہوں ان کا جائزہ لیا جائے اور انھیں دور کرنے کی تدبیریں سوچی جائیں۔

۶۔ اگر مقامی جماعت میں کوئی صاحب درس قرآن کی اہلیت رکھتے ہوں تو ہفتہ وار درس ہو ورنہ تفہیم القرآن کی مدد سے کتاب اللہ میں بصیرت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ہفتہ وار اجتماع کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ارکان کو جماعت سے وابستہ رکھنے اور ان کے اندر تحریک سے دلچسپی اور باہمی تعاون کی روح کو برقرار رکھنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اس سے تغافل برتنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جماعت بیخ بستہ ہو جائے گی، ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ رہے گا کہ ہم میں سے کون لوگ تحریک سے واقعی دلچسپی رکھتے ہیں اور کون نہیں رکھتے، ہمارے ارکان ایک دوسرے سے اجنبی رہیں گے، ان کے درمیان نہ دوستی و رفاقت کا رشتہ مضبوط ہو سکے گا، نہ وہ جماعت کے کاموں میں تعاون کر سکیں گے، اور نہ ایک دوسرے کی اصلاح میں مددگار بن سکیں گے۔

تیسری چیز جس کی طرف امیر جماعت نے تمام رفقاء کو پورے زور کے ساتھ توجہ دلائی وہ یہ تھی کہ انھیں اپنے عہد کی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور ادا کرنے کی فکر کرنی چاہیے اور ہر شخص کو اپنی قوتوں اور قابلیتوں کا پورا جائزہ لے کر ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ کیا کام کر سکتا ہے، پھر جس کام کی اہلیت اسے اپنے اندر محسوس ہو اس کو انجام دینے میں بس لگ جانا چاہیے۔ یہ وقت وہ ہے جو ہم سے اپنی انتہائی حد وسع تک سعی و کوشش کا مطالبہ کر رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایک لمحہ کا انتظار کیے بغیر ہم میں سے ہر شخص اٹھے اور جس سے جو کچھ ہو سکتا ہے کرے۔ جو اہل علم ہیں وہ تخریب و تعمیر افکار کی مہم میں مصروف ہوں، جو اہل تعلیم ہیں وہ نئی نسل کی تیاری کے لیے مستعد ہو جائیں، جو ادیب ہیں وہ ادب کی مختلف راہوں سے نظام حاضر پر حملہ کریں اور نظام اسلامی کی دعوت پھیلائیں، جو مضمون نگار ہیں وہ اخباروں اور رسالوں میں اظہار خیال شروع کر دیں، جو بات چیت سے لوگوں پر اثر ڈالنے کی قوت رکھتے ہیں وہ انفرادی تبلیغ کی مہم میں مصروف ہو جائیں، جنھیں دیہاتیوں میں کام کرنے یا عوام کو خطاب کرنے کا تجربہ ہو وہ دیہات میں گھومیں اور عامۃ الناس کی اصلاح کے لیے کوشش کریں، جن کو اللہ نے بہتر معاشی حالات دیے ہیں وہ بیت المال کی تقویت کی فکر کریں۔ غرض کسی قوت کی ایک رمق بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ رہا یہ سوال کہ آپ کتنا کام کریں اور کس حد تک کریں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا بہترین فیصلہ آپ کا ضمیر ہی کر سکتا ہے۔ آپ اتنا کام کریں اور اس حد تک کیے چلے جائیں جس کے بعد آپ کا ضمیر مطمئن ہو جائے کہ خدا جب آپ سے آپ کے وقت اور قوتوں کا حساب لے گا تو آپ اس کارنامۂ خدمت کو پیش کر کے مغفرت کی امید کر سکیں گے۔

آخر میں جناب فضل الرحمٰن صاحب (مونگیر) کی ایک اسکیم زیر بحث آئی جس کا مفاد یہ تھا کہ ارکان جماعت کو مال حرام سے اجتناب کی وجہ سے جو مالی مشکلات پیش آتی ہیں انہیں دور کرنے کے لیے مختلف مقامات پر اس طرز کی کاروباری اسکیمیں عمل میں لائی جائیں کہ کچھ مالدار اور کچھ کارندے مل کر دولت فراہم کریں اور یہ دولت ایک مقررہ تناسب سے سرمایہ لگانے والوں، محنت کرنے والوں اور جماعت کے بیت المال پر تقسیم ہوتی رہے۔ اس طرح مختلف مقامات پر تبلیغی اور تعلیمی مراکز کو جاری کر کے کام کی رفتار تیز کی جا سکتی ہے۔

اس تجویز پر مشاورتی گفتگو کچھ دیر تک ہوتی رہی۔ مولینا امین احسن صاحب نے اس سلسلہ میں ایک مختصر تقریر کی جس میں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر ارکانِ جماعت باہم انفرادی طور پر معاشی امور میں ایک دوسرے کی معاونت کریں تو یہ نہایت احسن اور ضروری ہے بلکہ جہاں کوئی رکن معاشی مشکلات میں مبتلا ہو وہاں تمام ارکان کا فرض ہے کہ اس کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے جو کچھ وہ کر سکتے ہیں، کریں۔ لیکن جماعت کو اپنی جماعتی حیثیت میں اعلائے کلمۃ اللہ کی دعوت اور جدوجہد کے سوا کوئی کاروباری حرکت نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ایک انقلابی جماعت ایک پہلو سے کاروباری ادارہ بھی بن جائے تو ایک تو اس کی مساعی بالکل تقسیم ہو کر رہ جائیں گی۔ دوسرے کچھ لوگ بلا کسی حقیقی جذبہ کے محض معاشی مفاد کی ہوس میں اس کے اندر جذب ہونا شروع ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے اصل مقصد کو نقصان پہنچے گا۔ اس خیال کی تائید جناب امیر نے بھی کی اور بغیر کسی ووٹنگ کے فضل الرحمٰن صاحب نے خود اس نقطۂ نظر کو تسلیم کر لیا اور اپنی اس تجویز کو جو بہت دنوں کے غور و خوض کے بعد مرتب کر کے لائے تھے، بلا تأمل واپس لے لیا۔

دوسرے دن ارکان جماعت سے انفرادی تبادلۂ خیالات جاری رہا اور ہر شخص اور ہر جماعت کو مقامی ضروریات کے لحاظ سے امیر جماعت نے مشورے اور ہدایات دیں۔

عام ملاقاتوں کے لیے ۲۳ اکتوبر کا دن مقرر کیا گیا تھا لیکن دربھنگہ اور دوسرے مقامات سے مختلف احباب ۲۲ کی شام سے ہی آنے لگے جن میں مسلم لیگ، امارتِ شرعیہ، جمعیۃ العلماء اور دوسری جماعتوں سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی شامل تھے۔ ان سے گھنٹوں امیر جماعت اور دوسرے رفقاء تبادلۂ خیالات فرماتے رہے اور اپنے مسلک کی وضاحت اور ان غلط فہمیوں کی تردید کی جو مختلف حلقوں میں جماعت سے متعلق پائی جاتی ہیں۔ ان گفتگوؤں کا خلاصہ پیش کر دینا مشکل ہے۔ مختصراً دو تین باتوں کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ بعض حلقوں کی طرف سے مسلمانوں میں یہ غلط فہمی بکثرت پھیلائی گئی ہے کہ ہم عام مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ اس کا اثر دربھنگہ میں بھی پایا جاتا تھا۔

اگرچہ اس کی عملی تردید کے لیے یہ بات کافی تھی کہ ہم نے جمعہ کی نماز عام مسلمانوں کیساتھ ادا کی، لیکن اس پر بھی لوگوں کے لیے یہ سوال دریافت طلب ہی رہا اور جواب میں امیر جماعت نے لوگوں کو صاف صاف بتا دیا کہ یہ محض ایک بہتان ہے جو ہماری دعوت اصلاح میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے جان بوجھ کر لگایا جا رہا ہے۔ دوسرا شبہ عام طور پر مختلف جماعتوں میں یہ پھیلا ہوا ہے کہ ہماری ان سے براہ راست کوئی کشمکش ہے۔ اس سلسلہ میں بھی صاف صاف بتا دیا گیا کہ براہ راست کسی جماعت کے خلاف ہمارا کوئی معرکہ (Campaign) نہیں ہے۔ ہم جن امور میں مختلف جماعتوں کے مسلک سے اختلاف رکھتے ہیں ان کی وضاحت لٹریچر میں کر دی گئی ہے۔ اب ہمارا اصلی تصادم کافرانہ نظام حیات سے ہے، محدود مقاصد پر کام کرنے والی جماعتی ہیئتوں (Political bodies) سے نہیں ہے۔

بہت سے لوگ اس بات کو بھی سمجھنا چاہتے تھے کہ اسلامی انقلاب برپا کس طرح ہوگا؟ اس کی توضیح کرتے ہوئے مولانا مودودی صاحب نے بتایا کہ آغاز ہمیشہ افکار کی تبدیلی اور ذہنیتوں کی نئی تعمیر سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک اصولی جماعت کو اپنے نصب العین کی طرف بڑھنے کے لیے وہ مشکلات پیش نہیں آتیں جو ایک قومی گروہ کو پیش آتی ہیں۔ ایک قوم کے لیے تو جنگ میں یہ سوال بڑا اہم ہے کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلہ کیلیے تربیت یافتہ آدمی اور سامان کہاں سے لائے لیکن ایک اصولی جماعت کے لیے یہ سوالات اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کے لیے تو صرف یہ سوال اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی دعوت کو جو لوگ لیکر اٹھیں وہ اپنے اصولوں پر اعتقادی اور عملی طور پر سچا ایمان رکھنے والے ہوں جس کے ذریعہ سے حریفوں کے دل اور دماغ مفتوح ہو سکتے ہوں۔ اس طرح جب دعوت اس منزل پر پہنچتی ہے جہاں نظام حاضر سے اس کا مسلح تصادم ہونے لگتا ہے تو اسے تمام ساز و سامان اور ہر قسم کے تربیت یافتہ آدمی خود نظام حاضر ہی سے ملتے چلے جاتے ہیں۔ اسے آدمی بنانے نہیں پڑتے بلکہ بنے بنائے آدمیوں کو مسخر کرنا ہوتا ہے۔

"حلقہ مطالعہ اسلامی" کی طرف سے عام جلسہ کا اہتمام کیا گیا تھا اور پروگرام یہی تھا کہ جناب امیر عوام کو بھی خطاب کریں۔ اس پروگرام کے مطابق بہت سے لوگ محض مولانا کی تقریر سننے کے لیے آئے تھے مگر افسوس ہے کہ منتظمین جلسہ کا پروگرام بدلنا پڑا اور مولانا کی تقریر نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دربھنگہ میں ایک گروہ چند روز پہلے سے فتنہ انگیزی میں مشغول تھا اور اس بات کا امکان تھا کہ یہ لوگ جلسہ عام میں افتراق برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ حالات سنکر امیر جماعت نے جلسہ میں شرکت سے معذرت ظاہر کی کیونکہ ان کا مسلک یہ ہے کہ فتنہ سے اجتناب کیا جائے اور جو لوگ ہماری دعوت کو سننا نہ چاہتے ہوں ان کے کانوں میں حق کی آواز کو زبردستی ٹھونسنے کی کوشش نہ کی جائے۔ چنانچہ ان کے بجائے اجلاس عام میں ملک نصر اللہ خان عزیز صاحب مدیر "مسلمان" لاہور نے تقریر کی جو بحیثیت مجموعی کامیاب رہی۔

مطبوعات

اسٹالین مترجمہ مسٹر آصف علی۔ بیرسٹرایٹ لا۔ صفحات ۴۴۲۔ قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔

موجودہ دَور کے سیاسی ادیان میں سے سب سے کم عمر روس کا سرکاری مذہب "مارکسزم" ہے۔ جس کا خدا مارکس، پیغمبر لینن، الکتاب سرمایہ اور کلمہ روٹی ہے۔ اس دین کے عملی نفاذ کے لیے جو انقلاب لینن کی سرکردگی میں رونما ہوا اس کی تکمیل اسٹالین کی مرہونِ منت ہے اور وہی "دینِ معدہ" کا خلیفۂ اول ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اشتراکیت کو سمجھنے کے لیے اسٹالین کی سوانحعمری کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ یورپ کی ہر زبان میں اسٹالین پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ لیکن بہت کم کتابیں ایسی ہیں جو اسٹالین کی زندگی کے جملہ پہلوؤں کو سامنے لاتی ہوں۔ مسٹر آصف علی نے ان کتابوں میں سے اسٹیفن گریہم کی کتاب کو ترجمہ کے لیے منتخب کیا ہے جس میں اچھی طرح واضح کیا گیا ہے کہ کیوں مارکسزم کے ٹراٹسکی جیسے "مومنینِ فاتحین" پسپا ہوگئے اور اس کی تحریف کرنے والے منافقین کا سرخیل اسٹالین قیادت پر فائز ہوگیا۔

دراصل "مارکسزم" اپنے فکری نقطۂ آغاز ہی سے انسانی فطرت کو نظرانداز کردیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عملی نفاذ کا تجربہ اول قدم پر ہی ناکام ثابت ہوا اور خود اس دین کا پیغمبر لینن ہی اسے مسخ کرنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ زبان سے "جاپ" تو کرتا تھا مارکسزم کے اصولوں کا لیکن عملاً اس نے یورپ کی تجربی سیاست ہی کو اصول بنالیا اور بے دھڑک مارکسزم کی قطع و برید کرتا گیا۔ ان حالات کے ماتحت کمیونسٹ پارٹی اندرونی طور پر دو گروہوں میں منقسم ہوتی گئی۔ ایک خالص مارکسزم کے علمبرداروں کا گروہ تھا جن میں نمایاں ترین شخصیت ٹراٹسکی کی تھی۔ دوسرا گروہ اسوۂ لینن کے رمز شناس منافقین کا تھا جن میں اسٹالین بھی شامل تھا۔ لینن کی موت پر یہی دوسرا

گروہ غالب رہا اور قیادت ٹراٹسکی کے بجائے اسٹالین کے قبضہ میں آگئی۔ تاریخ انقلابات کا فطری اقتضاء تھا بھی یہی۔ اگر ٹراٹسکی کامیاب ہو نکلتا تو تحریک ناکام ہو کے رہ جاتی۔ اسٹالین جب اوپر آگیا تو اس نے پارٹی کو اس "مومن" عنصر سے پاک کرنے کے لیے نہایت ظالمانہ کارروائیاں سرانجام دیں۔ نہایت درجہ وسیع نظام جاسوسی اور استبدادی عدالتیں قائم کی گئیں۔ قتل، قید اور جلاوطنی کا بازار گرم ہو گیا اور جب اس کارخانہ کانٹوں سے صاف ہو گیا تو اس نے پوری آزادی سے مارکس کے اصولوں کا تیاپانچا کیا۔ انفرادی ملکیت کا کلی استیصال، کامل معاشی مساوات اور ادارۂ حکومت کا خاتمہ، یہ سب امور ایک خیالی مستقبل کے طاقچے پر دھر دیے گئے اور دنیا کو مطمئن کر دینے کے لیے اشتراکی جمہوریتوں کی وحدت کو اس خیالی مستقبل کا ابتدائی مرحلہ قرار دیدیا گیا۔ زیر نظر کتاب میں انقلاب۔ انقلاب کی اس داستان کو پیش کرتے ہوئے اس کے ہیرو اسٹالین کی شخصیت کو پورے طور پر نمایاں کر دیا گیا ہے۔

کتاب کا مصنف یورپ میں اسٹالین کا غیر جانبدار سوانح نگار مانا جاتا ہے مگر مترجم کو اس سے اتفاق نہیں ہے اور بعض مقامات کی بازاری عبارت اور واقعات کے غیر واضح بیانات سے مترجم کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن اتنی بات ضرور واضح ہے کہ اسٹالین کی زندگی میں ظالمانہ کارناموں اور گھناؤنے واقعات کی کمی نہیں ہے۔ اس کی سیرت تو ہے کسی "آدمی" کی سیرت ہے نہ کہ گوشت پوست کے آدمی کی۔ رہا ترجمہ تو وہ کوتاہیوں سے خالی نہیں ہے اور کتابت کی غلطیاں جب اس کے ساتھ مل جاتی ہیں تو عبارت بہت بے لطف ہو جاتی ہے۔

فلسفۂ نماز از جناب الحاج القاری الحافظ محمد طیب صاحب مہتمم جامعہ قاسمیہ، دارالعلوم، دیوبند۔
قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- ناظم و مہتمم مدرسہ عربی خیر المدارس، جالندھر شہر۔

یہ مولانا کا ایک خطبہ ہے جو خیر المدارس جالندھر کے ایک سالانہ جلسہ میں بیان کیا گیا تھا۔ اس میں واضح کیا گیا ہے کہ نماز مسلمان کی عملی زندگی پر کیا اثر ڈالتی ہے۔ لیکن جناب مؤلف کلامی بحث کی رَو میں بہت دور نکل گئے ہیں